معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے　　فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　　ہوائی ڈاک　　بیس پونڈ　　یا　　بتیس ڈالر

بحری ڈاک　　سات پونڈ　　یا　　گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ حافظ محمد یحیی　شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۸ ماہ جمادی الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۶ء عدد ۴

شذرات

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ پولیس فائرنگ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک طالب علم ہلاک اور کئی طلبہ شدید زخمی ہوگئے، پورے ملک میں بجا طور پر اس افسوسناک واقعہ کی شدید مذمت ہو رہی ہے، لیکن آخر ہلاک ہونے والے طالب علم کے والدین اور اعزہ کے غم کی تلافی کیا ہوگی اور انکے درد کا درماں کیا ہوگا؟ یہ عجیب بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں کوئی معمولی واقعہ بھی ہوتا ہے تو شرپسند عناصر اور خود یونیورسٹی کے مفاد پسند لوگ اسے ہوا دے کر نہایت سنگین بنا دیتے ہیں، طلبہ بھی انکی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی ناعاقبت بینی کی وجہ سے ہنگامہ آرائی اور تشدد پر آمادہ ہو کر معاملات کو نہایت پیچیدہ اور خراب کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس مسلم یونیورسٹی کے بارے میں اتنی حساس اور فرض شناس ہے کہ اسے طلبہ کو بھون دینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، احتجاج، ہنگامے اور تشدد کے واقعات تعلیمی اداروں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، لیکن کہیں پولیس کی بے رحمی و بے دردی کا یہ منظر دیکھنے میں نہیں آتا۔ اگر یونیورسٹی اور ضلع انتظامیہ نے افہام و تفہیم کا یہ رویہ اختیار کیا ہوتا تو ایسا دل دوز اور جگر خراش واقعہ نہ رونما ہوتا، پولیس کا یہ ناروا اقدام قابل مذمت ہی نہیں قابل مواخذہ بھی ہے۔

موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن کے آنے سے پہلے مسلم یونیورسٹی سخت بحران سے دوچار تھی، داخلوں میں کھلے عام بدعنوانیاں ہو رہی تھیں، تعلیم کا نظام درہم برہم تھا، طلبہ کے گروپ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے، یونیورسٹی کیمپس میں ضرب و حرب کے واقعات اور خون خرابہ ہو رہا تھا، مفاد پسند لوگ اس وقت کے نیک طبیعت وائس چانسلر پروفیسر نسیم فاروقی کی نرمی و مروت کی وجہ سے بڑے ڈھیٹ ہوگئے تھے اور خوب فائدے اٹھا رہے تھے۔ ایسے بدتر حالات میں نئے وائس چانسلر کے انتخاب میں کورٹ کے اکثر ممبروں نے اس کو خاص طور پر مدنظر رکھا کہ

وہ دیانت دار، قوم و ملک کا درد، انتظامی امور کا تجربہ رکھنے والا اور قدرے سخت گیر ہو، ہمارے اندازے میں موجودہ وائس چانسلر نے علمی و تعلیمی ماحول برپا کرنے اور حالات کو معمول پر لانے کے لیے موثر اصلاحی اقدامات کیے، لیکن اصلاحات و تحقیقات کی زد میں آجانے والوں نے اپنے بے نقاب ہوجانے کے اندیشے اور طرح طرح کے مفادات کو پامال ہوتا دیکھ کر بڑی عیاری سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ دو سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ یونیورسٹی کو دو مرتبہ بند کرنا پڑا اور اب کی یہ نہایت ناخوشگوار حادثہ پیش آیا جو تکلیف دہ ہی نہیں سب کا سر شرم سے جھکا دینے والا ہے۔

برسر اقتدار اشخاص سے شکایتیں ہو جانا عام بات ہے، گو اسٹاف کا بڑا طبقہ بے غرض اور اصلاح پسند ہے، لیکن وہ یونیورسٹی میں پیش آنے والے حالات و واقعات سے بڑی حد تک بے تعلق رہتا ہے، علاوہ ازیں وہ بھی وائس چانسلر صاحب کی سخت دار و گیر اور درشتی کی وجہ سے ان کو پسند نہیں کرتا اور جا و بیجا ان پر تبصرے بھی کرتا رہتا ہے جس سے مفسد اور مفاد پسند لوگوں کی ایک طرح سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور انہیں کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے، رہے طلبہ تو وہ اپنی عدم پختگی کی بنا پر ہر اس شخص کے پیچھے لگ جاتے ہیں جو بظاہر ہمدرد و خیرخواہ کے روپ میں ان کے سامنے آتا ہے، اس لیے جن لوگوں کو صرف اپنا ہی مفاد عزیز ہوتا ہے اور وہ یونیورسٹی کی فلاح و بہبود سے کوئی سروکار نہیں رکھتے وہ سادہ لوح لوگوں خصوصاً سریع الاشتعال طلبہ کو اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں اور انہیں آگے کر کے اور خود پس پردہ رہ کر ایسی سازشیں کرتے ہیں کہ نظام کی ساری چولیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں اور ہر طرح کا انتشار و خلفشار رونما ہونے لگتا ہے، معمولی باتوں کو بھی اپنی فتنہ انگیزی سے ایسا اہم اور پیچیدہ مسئلہ بنا دیتے ہیں جس میں الجھ کر طلبہ صرف ہنگاموں اور شورشوں کے لیے وقف ہو جاتے ہیں اور اس بڑے مقصد کو بھول جاتے ہیں جس کو حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹی میں ان کا داخلہ ہوا تھا، اس سے ان کا تعلیمی نقصان تو ہوتا ہی ہے لیکن کبھی کبھی ان کو اس کا ایسا سخت خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے جس کا ایک نمونہ یہ موجودہ دردناک سانحہ ہے۔

وائس چانسلر اور یونیورسٹی انتظامیہ بے قصور اور بری الذمہ نہیں ہے، جب یونیورسٹی کے موجودہ حالات کے پیچھے مفاد پسندوں کی ریشہ دوانیوں اور یونیورسٹی کے مخالفوں اور بدخواہوں کی گہری سازشوں کا پیچ در پیچ سلسلہ ہے جس کی ایک کڑی زہر خورانی کا تازہ واقعہ بھی ہے تو انہیں کیوں نظر انداز کیا جاتا رہا اور ان کا مناسب تدارک کیوں نہیں کیا گیا، اگر بروقت ان معاملات سے نپٹ لیا گیا ہوتا تو ایک طالب علم کی جان نہ جاتی، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک ادنیٰ ممبر ہونے کے باوجود ابھی تک راقم کو وائس چانسلر صاحب کا نیاز حاصل نہیں ہوا ہے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اساتذہ وطلبہ سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، اس لیے ان کے مسائل و مشکلات سے واقف نہیں ہوتے، ان کے مزاج کی درشتی اور آمرانہ رویے کی شکایت بھی کی جاتی ہے، بلاشبہ بے لاگ عدل ہی ایک حکمراں کا شیوہ ہونا چاہیے، لیکن اسے رحم دل بھی ہونا چاہیے، یہی انسانی شرافت کا جوہر ہے، قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی بھی کی جائے اور بے ضابطگی اور بے راہ روی پر باز پرس بھی کی جائے، لیکن یونیورسٹی کو ایک خاندان کے نظام کی طرح چلایا جائے، اساتذہ کے ساتھ اکرام واعزاز اور طلبہ کے ساتھ رحم و شفقت کا معاملہ کیا جائے، انکی خوبیوں کی تحسین کی جائے اور خرابیوں پر تنبیہ کی جائے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلم یونیورسٹی فرقہ پرستوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ اس کی ہوا خیزی کے برابر درپے رہتے ہیں، جس کے لیے یونیورسٹی کا بدخواہ اور مفاد پسند طبقہ انہیں موقع دے دیتا ہے، اس لیے انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ کو اس پہلو سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور موجودہ واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیق کرکے جو بھی اس میں ملوث پائے جائیں انہیں رو رعایت کے بغیر مناسب سزا دی جانی چاہیے۔

مقالات

علمائے اصول اور حدیث کے اقسام

از ڈاکٹر محمد باقر خاں خاکوانی۔ ملتان

(۲)

خبر مشہور

مشہور لغت میں کسی شے کے واضح ہونے، معروف ہونے یا پھیل جانے کو کہتے ہیں۔ اس کا مادہ شہر ہے اور یہ شہر سے اسم مفعول ہے۔ عربی میں مہینے کو بھی "شہر" اس کے دنوں کی تعداد معروف ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز لوگوں میں معروف ہوجائے یا پھیل جائے اسے لغت میں مشہور کہا جاتا ہے[1]۔

خبر مشہور کی اصطلاحی تعریف میں بھی علماء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے احناف اس کو خبر کی ایک مستقل قسم مانتے ہیں اور جمہور اس کو خبر واحد کی ایک ذیلی قسم سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک نے اس کی اصطلاحی تعریف اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کی ہے۔

احناف کی رائے احناف کے نزدیک خبر مشہور وہ خبر ہے جو اصل میں دور صحابہ میں خبر واحد تھی پھر دوسرے دور، دور تابعین میں پھیل گئی اور اسے اس قدر کثیر راویوں نے روایت کیا کہ ان کے مخفی طور پر جھوٹ پر متفق ہونے کا تصور نہ کیا جاسکتا ہو اور اسے علماء نے مقام قبولیت بخش دیا ہو ان کی رائے میں کسی خبر کے پھیلنے کا اعتبار دوسرے یا تیسرے دور تک کیا جائے گا اور اگر قرون ثلاثہ کے بعد کوئی خبر پھیلی ہے تو وہ معتبر نہ ہوگی۔ احناف کے نزدیک خبر مشہور کی شرائط یہ ہیں۔

۱۔ وہ احاد الاصل ہو یعنی دور صحابہ میں وہ خبر واحد ہو۔

۲۔ اس کو دور تابعین و تبع تابعین میں اتنے راوی روایت کریں کہ ان کا مخفی طور پر جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔

۳۔ دور تابعین و تبع تابعین کے علماء اسے قبول کریں۔

احناف کا مشہور کو خبر واحد کی ایک ذیلی قسم تسلیم نہ کرنے کا سبب وہ حدیث ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین ادوار (دور صحابہ، دور تابعین، دور تبع تابعین) کو خیر القرون کہا اور ان کی بھلائی کی شہادت دی۔

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم یاتی من بعدھم قوم یشھدون ولا یستشھدون[۲]

بہترین لوگ میرے زمانہ والے ہیں، پھر جو اس کے بعد آئیں۔ پھر جو اسکے بعد آئیں۔ اس کے بعد وہ لوگ آئیں گے کہ شہادت دیں گے لیکن انکی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔

احناف کے نزدیک اگر کوئی حدیث ان تین ادوار میں خبر واحد سے خبر متواتر کے درجہ تک پہنچ جائے اور اس دور کے علماء اسے مجموعی طور پر قبول کرلیں تو یہ اس خبر کی قبولیت پر علماء کا اجماع ہے، اس لیے ایسی خبر کو خبر واحد کہنا درست نہیں کیونکہ خبر واحد میں اتصال اور معنی دونوں لحاظ سے شبہ ہوتا ہے۔ لیکن خبر مشہور میں اتصال کے لحاظ سے شبہ اس طرح ہے کہ مبادا صحابہ کرام سے اس کے نقل کرنے میں کوئی غلطی واقع ہوگئی ہو یا حدیث کو سمجھنے میں کوئی شبہ پڑ گیا ہو لیکن خیر القرون میں اس کا درجہ متواتر تک پہنچ جانا اور اس کی قبولیت پر علماء کا اجماع اس میں معنی کے شبہ کے امکانات کو ختم کر دیتا ہے اور اس کو خبر

واحد کے مقام سے بلند کر دیتا ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے:

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ[۳]

میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوگی۔

اس حدیث کی رو سے خیر القرون کے علماء کی خبر کے صدق پر شہادت اور راویوں کی کثرت اسے خبر متواتر کے مقام پر پہنچا دیتی ہے لیکن اتصال میں شبہ کی وجہ سے یہ متواتر نہیں رہتی۔ اس لیے اسے احناف کے نزدیک خبر مشہور کا نام دیا گیا ہے۔[۴]

جمہور کی رائے

جمہور علمائے اصول مشہور کو حدیث کی ایک علٰحدہ قسم شمار نہیں کرتے بلکہ اس کو خبر واحد کی ایک ذیلی قسم تصور کرتے ہیں۔ سیف الدین آمدی کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے:

خبر الواحد ان نقلہ جماعۃ تزید علی الثلاثۃ او الاربعۃ سمی مستفیضا مشھورا[۵]

خبر واحد کو اگر راویوں کی ایسی جماعت جس کی تعداد تین یا چار سے زیادہ ہو روایت کرے تو اس کا نام مستفیض یا مشہور ہے۔

بعض دیگر علماء کی رائے میں ہر وہ خبر جسے نقل کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں، یا ایسی خبر جو ضعف احاد سے بلند ہو مگر درجہ متواتر تک نہ پہنچے خبر مشہور ہے[۶]

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ خبر مشہور کے بارے میں احناف کا موقف جمہور علمائے اصول اور محدثین سے بالکل مختلف ہے۔ جمہور علمائے اصول خبر مشہور کی اصطلاحی تعریف کے ضمن میں محدثین سے اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن

دقیق مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خبر واحد کی یہ ذیلی تقسیم بھی محدثین نے علمائے اصول سے اخذ کی ہے نہ کہ علمائے اصول نے محدثین سے [۸]

خبر واحد اہل لغت کے نزدیک واحد اور احاد میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔

خبر واحد کی اصطلاحی تعریف میں علمائے اصول کے مابین اختلاف ہے اور اس اختلاف کی بنیادی وجہ سنت کی قسموں میں اختلاف ہے۔ احناف سنت کو تین بنیادی اقسام متواتر، مشہور اور واحد میں تقسیم کرتے ہیں لیکن جمہور سنت کے دو بنیادی اقسام متواتر اور واحد بیان کرتے ہیں، ان کے نزدیک مشہور، مستفیض یا اس قسم کے تمام اقسام سنت خبر واحد میں شامل ہیں اور اس کی ذیلی اقسام ہیں۔

احناف کی رائے میں خبر واحد کی تعریف کو فخر الاسلام بزدوی نے اس طرح بیان کیا ہے:

هو كل خبر يرويه الواحد	ہر وہ خبر جس کو ایک، دو یا اس سے
او الاثنان فصاعدا، لا	زیادہ راوی روایت کریں اور اس
عبرة للعدد فيه بعد ان	میں راویوں کی کوئی تعداد معتبر نہیں
يكون دون المشهور و	مگر یہ کہ وہ خبر مشہور اور متواتر
المتواتر [۹]	کے درجہ تک نہ پہنچے۔

گویا احناف کے نزدیک خبر واحد وہ ہے جس کو ایک راوی دوسرے ایک راوی سے نقل کرے، ایک راوی جماعت سے روایت کرے یا راویوں کی جماعت ایک راوی سے روایت کرے۔ ان کے نزدیک راویوں کی تعداد کا اعتبار نہیں

جب تک حدیث مشہور یا متواتر کی حد تک نہ پہنچے [۱۰]

مالکی، شافعی اور حنبلی علمائے اصول کی رائے میں ہر وہ خبر جو متواتر کے تمام شرائط یا کوئی ایک شرط پوری نہ کرے خبر واحد ہے اور اس تعریف پر تمام جمہور علماء متفق ہیں لیکن ہر ایک نے اسے جامع و مانع بنانے کے لیے مختلف اسلوب اختیار کیے ہیں مثلاً شیرازی خبر واحد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

اعلم ان خبر الواحد ما	جان لے کہ خبر واحد وہ ہے جو
انحط عن حد التواتر [۱۱]	متواتر کی شرائط پوری نہ کر سکے۔

بدخشی کے نزدیک ہر وہ خبر جو متواتر نہیں، چاہے وہ مستفیض ہو یعنی جس کو تین سے زیادہ راوی روایت کریں یا غیر مستفیض ہو یعنی اس کو تین یا اس سے کم راوی روایت کریں، خبر واحد شمار ہوگی [۱۲]

ابو الحسن ماوردی نے اس کی تعریف اس انداز میں کی ہے۔

واما اخبار الاحاد فهو ما	خبر واحد وہ خبر ہے جو اتنی قلیل
اخبر الواحد العدد القليل	تعداد سے مروی ہو جن کا مخفی طور
الذي يجوز على مثله	پر جھوٹ، غلطی یا بھول پر اتفاق
تواطؤ على الكذب او	کر لینے کا گمان جائز ہو۔
الاتفاق في السهو والغلط [۱۳]	

خبر واحد کے اقسام خبر واحد کی تقسیم علمائے اصول نے مختلف طریقوں سے کی ہے۔ بعض علماء نے اس کی تقسیم عمومی لحاظ سے کی ہے، ایک فریق نے اس کی تقسیم حکم کے لحاظ سے کی ہے اور جمہور علماء نے اس کی تقسیم مقبول و مردود کی

حدیث کے اقسام

حیثیت سے کی ہے۔

۱۔ عمومی تقسیم : ماوردی نے خبر واحد کی عمومی تقسیم کرتے ہوئے اس کے تین اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ اخبار المعاملات ۲۔ اخبار الشہادات ۳۔ اخبار السنن والدیانات او العبادات۔

۱۔ اخبار المعاملات : یہ وہ خبر ہے جس میں مخبر کے ثقہ یا عادل ہونے کی شرط نہیں بلکہ اس میں صرف سامع کا خبر پر دل جم جانا شرط ہے۔ اس لیے معاملات میں نیک و بد، مسلم و کافر تمام کی خبر قبول کی جائے گی مثلاً کوئی شخص دوسرے کو خبر دے کہ یہ ہدیہ آپ کے لیے فلاں آدمی نے بھیجا ہے تو اسے وہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲۔ اخبار الشہادات : شہادت کی خبر میں دو شرطیں ہیں جن کا حکم شریعت نے بھی دیا ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔ ان میں سے پہلی عدالت ہے اور دوسری تعداد اور یہ تعداد زیادہ سے زیادہ چار جو زنا میں ہے اور کم سے کم دو جو مالی معاملات میں ہے۔ اخبار الشہادات ان دو شرائط کی وجہ سے اخبار معاملات سے اہم ہو جاتی ہیں۔

۳۔ اخبار السنن والعبادات : اس میں خبر واحد کی قبولیت میں اختلاف ہے۔ اصم اور ابن علیہ ان کو حجت نہیں مانتے اور کچھ کے نزدیک اگر اس کے ساتھ کوئی قرینہ ہو تو قبول کیے جائیں گے۔ لیکن جمہور کے نزدیک یہ کچھ شرائط کے ساتھ موجب عمل ہیں۔[۱۳]

ب۔ حکم کے لحاظ سے خبر واحد کی تقسیم | بعض علمائے اصول نے خبر واحد کی تقسیم حکم کے لحاظ سے بھی کی ہے ان کی رائے میں خبر واحد کے دو حکم ہو سکتے ہیں پہلا یہ کہ یہ موجب علم و عمل ہے اور دوسرا یہ کہ موجب عمل ہے علم نہیں۔

۱۔ خبر واحد موجب علم : ایسی خبر واحد جو موجب علم ہو، اس کی چھ قسمیں ہیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ کی خبر کیونکہ صدق اس کی ذاتی صفات میں سے ہے۔

۲۔ ایسے شخص کی خبر جس کے ہاتھ سے معجزات ظاہر ہوں، کیونکہ یہ معجزات اس کے صدق کی دلیل ہیں یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر۔

۳۔ ایسا شخص جس سے معجزات ظاہر ہوں، اگر وہ کسی کے بارے میں یہ کہے کہ فلاں انسان سچا ہے اور جھوٹ نہیں بولتا تو اس انسان کی خبر بھی موجب علم ہوگی۔

۴۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی قول کہے یا کوئی فعل سرانجام دے اور آپؐ اس کو ٹوکیں اور نہ اس کی اصلاح کریں تو اس قول اور فعل کی خبر بھی موجب علم ہے۔

۵۔ ایک شخص جم غفیر کے سامنے ایک ایسی بات کہتا ہے جس کے بارے میں وہ لوگ اچھی طرح جانتے ہوں مگر اسے نہ ٹوکیں تو وہ خبر بھی موجب علم ہے۔

۶۔ ایسی خبر واحد جس کو امت مجموعی طور پر قبول کر لے تو اس سے بھی علم حاصل ہوتا ہے۔[۱۴]

۲۔ خبر واحد موجب عمل : اخبار احاد میں سے جو صرف موجب عمل ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں :

۱۔ مسند ۲۔ مرسل۔ لیکن شیرازی نے مسند کی مزید دو قسمیں بیان کی ہیں۔
موجب علم و موجب عمل اور مرسل کو علیحدہ قسم مانا ہے[۱۵]

ج۔ مقبول و مردود کی حیثیت سے تقسیم | جمہور علمائے اصول نے خبر واحد کی مقبول
یا مردود ہونے کے اعتبار سے دو اقسام بیان کی ہیں:

۱۔ مسند ۲۔ مرسل

۱۔ مسند = وہ خبر ہے جس کی اسناد متصل ہوں اور ان میں کوئی انقطاع
نہ ہو۔ ۲۔ مرسل = وہ خبر ہے جس کی اسناد میں ظاہری یا باطنی انقطاع ہو،
اس کو منقطع بھی کہا جاتا ہے[۱۶]

شریف تلمسانی نے خبر واحد کو دو قسموں میں مسند و غیر مسند میں تقسیم کرکے
غیر مسند کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ۱۔ منقطع ۲۔ مرسل ۳۔ موقوف۔

ان کے ہاں منقطع وہ خبر ہے جس کی سند میں کوئی راوی چھوٹ جائے اور
مرسل وہ خبر ہے جس کو غیر صحابی روایت کرے اور موقوف وہ خبر ہے جو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچے۔ جیسے حضرت عائشہ سے مروی ہے:

لا اعتکاف الا بصوم[۱۷] روزہ کے بغیر اعتکاف نہیں ہے۔

تو یہ حدیث موقوف ہے[۱۸]

اسی طرح احناف نے خبر واحد کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ مسند، منقطع
(مرسل) اور مطعون۔[۱۹] مسند کو کسی نے بھی مزید اقسام میں تقسیم نہیں کیا لیکن منقطع
اور مطعون کی احناف نے کئی قسمیں بیان کی ہیں جو پہلے گذر چکی ہیں۔

خبر واحد کی قبولیت کے شرائط | علمائے اصول نے خبر واحد میں شبہ کے امکان

کی وجہ سے اس کی قبولیت کے لیے مختلف اقسام کی شرطیں لگائی ہیں ان میں سے
کچھ شرائط راوی سے متعلق ہیں اور بعض نفس خبر کے بارے میں ہیں۔ ان میں سے
بعض شرائط پر تمام علمائے اصول متفق ہیں اور کچھ پر ان کے درمیان اختلاف
ہے۔ مگر یہ بحث ہمارے مضمون کا موضوع نہیں ہے۔

اب خبر مسند، منقطع اور دوسری احکام کی تعریف پیش کی جارہی ہے۔

خبر مسند : لفظ مسند اسناد سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ لغوی طور
پر اس سے مراد اعتماد کرنا ہے۔ اس کا مادہ سند "س ن د" ہے جس سے لفظ
"مسند" نکلا ہے جس کے معنی یہ ہیں "وہ راستہ جو متن کی طرف جائے"۔ عمومی
اصطلاح میں مسند اس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں صحابہ کی مرویات جمع کی گئی
ہوں اور اس کے ہر باب میں ایک ایک صحابی کی روایات بیان کی جائیں اور
یہ حدیث کی ایک قسم بھی ہے۔ اس کی جمع مسانداور مسانید ہے[۲۰]

علمائے اصول کے نزدیک مسند وہ خبر واحد ہے جس کی اسناد رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہوں اور اس میں کوئی ظاہری یا باطنی انقطاع نہ ہو[۲۱]۔
انقطاع ظاہری سے مراد اس کی سند میں کوئی راوی ساقط نہ ہو اور باطنی سے
مراد حدیث، قرآن خبر متواتر، اجماع اور عقل سلیم کے تقاضوں کے مخالف نہ ہو۔

تمام علماء مسند کو صحیح خبر کی ایک قسم مانتے ہیں، اس پر عمل واجب قرار دیتے
ہیں، اس کو منقطع، مرسل، مطعون پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے مسائل مستنبط کرتے
ہوئے اس کے منکر کو بدعتی اور گمراہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک
شریعت کے اکثر احکام اسی خبر مسند کے ذریعے واقع ہوئے ہیں اور اگر اس کو بھی

ترک کر دیا جائے تو اس سے احکام شریعت میں خلل واقع ہوگا۔[۲۲]

خبر منقطع: منقطع کا مصدر "القطع" ہے۔ اس کے باب انفعال سے وہ اسم فاعل ہے۔ لغت میں اس کے معنی جسم کے بعض حصوں کو بعض سے علٰحدہ کرنا ہیں جیسے فقرہ "قطعت الحبل قطعاً فانقطع" سے مراد میں نے رسی کاٹی اور وہ کٹ گئی اور "المقطع" کاٹنے والے آلے کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا کلام منقطع ہوجاتا ہے اس کا تسلسل ٹوٹ گیا اور جاری نہ رہا یعنی کسی شے کو درمیان سے کاٹ دینا انقطاع کہلاتا ہے۔[۲۳]

علمائے اصول کی اصطلاح میں منقطع وہ خبر واحد ہے جس میں مندرجہ ذیل اسباب میں سے کوئی سبب پایا جائے۔

۱۔ سند میں انقطاع ہو یعنی خبر کی سند رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے مگر اس میں کہیں دو راویوں کے درمیان جو واسطہ تھا اس کو حذف کر دیا گیا ہو۔

۲۔ خبر قرآن، حدیث، متواتر یا عقل سلیم کے خلاف ہو۔

۳۔ حدیث کے راویوں میں کوئی خامی ہو۔

۴۔ حدیث کو حجت بنانے میں علماء کے درمیان اختلاف ہو۔[۲۴]

علمائے اصول عام طور پر منقطع کو مرسل بھی کہہ دیتے ہیں جیسے شیرازی لکھتے ہیں:

فالمرسل عند الاصولیین مرادف للمنقطع[۲۵]	مرسل علمائے اصول کے نزدیک منقطع کے مترادف ہے۔

لیکن احناف مرسل ایسی حدیث کو کہتے ہیں جس کو غیر صحابی راوی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرے۔ وہ اس کو منقطع کی ایک قسم منقطع ظاہر

شمار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حدیث منقطع عام ہے اور حدیث مرسل خاص۔ انہوں نے حدیث منقطع کی جو تقسیم کی ہے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔[۲۶]

خبر مطعون: خبر واحد اگر علمائے اصول کے مقرر کردہ شرائط پر پوری نہ اترے تو وہ منقطع یا مطعون ہوگی۔ منقطع کی بحث اوپر گذر چکی ہے۔ لفظ مطعون، طَعَنَ یَطْعَنُ، سے اسم مفعول ہے۔ لغت میں اس سے مراد کسی میں عیب نکالنا یا اعتراض کرنا ہے مثلاً "طعن فی عرضہ" سے مراد اس نے اس کی عزت پر اعتراض کیا اور "طعن فی رایہ" اس نے اس کی رائے پر اعتراض کیا یعنی کسی کی ذات، رائے یا حکم میں عیب نکالنے کو طعن کہتے ہیں اور مطعون وہ ہے جس میں عیب نکالا جائے یا جس پر اعتراض کیا جائے۔[۲۷]

اصطلاح میں خبر مطعون سے ایسی خبر مراد ہے جس پر حدیث کو روایت کرنے والا راوی خود اعتراض کرے یا اس پر غیر راوی کی طرف سے کوئی اعتراض وارد ہو۔ راوی کی طرف سے اعتراض کی یہ صورت ہے کہ وہ اپنی روایت کردہ حدیث کا صریح انکار کرے کہ میں نے یہ روایت بیان نہیں کی اور اگر وہ صحابی ہے تو اپنی مروی حدیث کے خلاف عمل کرے، یا عمل ترک کردے یا عام حدیث کو خاص کردے۔

غیر راوی کی طرف سے اعتراض کی یہ صورت ہے کہ اس کی حدیث کو صحابہ کرام یہ جانتے ہوئے کہ صحیح حدیث ہے متروک قرار دے دیں یا اسکے مخالف عمل کریں، یا محدثین کرام اس کی حدیث پر کسی قسم کا اعتراض کریں تو وہ حدیث مطعون کہلائے گی۔[۲۸]

خبر مطعون کی تفصیل اس طرح ہے۔

خبر مطعون

راوی اعتراض کرے

۱- راوی اپنی روایت کا صریح انکار کرے۔
۲- راوی حدیث کے خلاف عمل کرے۔
۳- راوی عام حدیث کو خاص کرے۔
۴- راوی حدیث پر عمل ترک کرے۔

غیر راوی اعتراض کرے

۱- اعتراض صحابہ کرام کی طرف سے وارد ہو
(الف) حدیث کو جانتے ہوئے اسکی مخالفت کریں۔
(ب) حدیث کو نہ جانتے ہوئے اس کی مخالفت کریں۔
۲- اعتراض ائمہ حدیث کی طرف سے وارد ہو۔
(الف) اعتراض مبہم ہو۔
(ب) اعتراض مفسر ہو۔

غرض علمائے اصول نے جہاں حدیث کے رد و قبول کے اپنے معیار قائم کیے ہیں وہیں انہوں نے اس کے اقسام بھی اپنے اصول روایت حدیث کو مدنظر رکھ کر بنائے ہیں اور وہ اس میدان میں محدثین کی اتباع نہیں کرتے بلکہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ محدثین نے علمائے اصول کے بیان کردہ اصول روایت حدیث کو لے کر ان کو اپنے قالب میں ڈھال کر عروج ثریا سے ہمکنار کیا، لیکن اصول فقہ کی بنیادی کتب کے مطالعہ سے کہیں بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ ان علماء نے حدیث کے میدان میں محدثین کے اصولوں کی اتباع کی ہو۔

حواشی

[1] جوہری، اسمٰعیل بن حماد۔ الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ۔ بیروت دار العلم للملایین، ۱۹۷۹ء۔ کتاب الراء، باب الشین [2] امام بخاری۔ صحیح بخاری۔ کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل اصحاب النبی [3] امام ترمذی۔ جامع ترمذی۔ ابواب الفتن، باب فی لزوم الجماعۃ [4] امام سرخسی۔ اصول السرخسی، محولہ بالا ایڈیشن، ج ۱، ص ۲۹۲ [5] سیف الدین الآمدی۔ الاحکام فی اصول الاحکام محولہ بالا ایڈیشن، ج ۲، ص ۹۴ [6] ابن نجار۔ شرح الکوکب المنیر۔ محولہ بالا ایڈیشن، ج ۲، ص ۳۴۶ [7] تفصیل کے لیے دیکھئے۔ ابن الصلاح۔ مقدمہ ابن الصلاح، محولہ بالا ایڈیشن، ص ۱۳۵ [8] البزدوی۔ اصول البزدوی، محولہ بالا ایڈیشن، ص ۱۵۲ [9] السمرقندی علاء الدین۔ میزان الاصول فی نتائج المعقول، قطر دار احیاء التراث الاسلامی۔ ۱۴۰۴ھ، ص ۴۳۱ [10] الشیرازی۔ کتاب اللمع۔ مکہ مکرمہ مکتبہ محمد صالح منصور۔ ۱۳۲۵ھ، ص ۱۶۴ [11] البدخشی محمد بن الحسن۔ شرح البدخشی بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ، ج ۲، ص ۳۲۰ [12] الماوردی۔ ادب القاضی، محولہ بالا ایڈیشن، ج ۱، ص ۳۰۷ [13] ایضاً، ج ۱، ص ۳۷۵-۳۷۷ [14] الباجی۔ احکام الفصول فی احکام الاصول۔ تحقیق عبداللہ محمد الجبوری، موسستہ الرسالہ ۱۹۸۹ء ص ۳۴۷-۳۴۸ [15] الشیرازی۔ کتاب اللمع، محولہ بالا ایڈیشن، ص ۱۷ [16] الباجی۔ الاشارۃ فی اصول الفقہ، محولہ بالا ایڈیشن، ص ۱۴ [17] امام مالک، موطا امام مالک۔ بیروت، دار الکتب العلمیہ، سن اشاعت درج نہیں ہے۔ کتاب الاعتکاف۔ باب مالا یجوز الاعتکاف الا بہ [18] شریف تلمسانی۔ مفتاح الوصول

فی علم الاصول، مکتبہ کلیات الازھریہ، سن اشاعت درج نہیں ہے، ص ۲۶

۱۹ البزدوی۔ اصول البزدوی، محولہ بالا ایڈیشن، ص ۱۹۱ ۲۰ بستانی بطرس معلم۔ محیط المحیط، مکتبہ و سن اشاعت درج نہیں ہے، ج ۱، ص ۱۰۰۹۔ ۲۱ الماوردی۔ ادب القاضی، محولہ بالا ایڈیشن، ج ۱، ص ۳۹۸ ۲۲ الشیرازی کتاب اللمع، محولہ بالا ایڈیشن، ص ۱۶۵ ۲۳ ابن منظور افریقی۔ لسان العرب محولہ بالا ایڈیشن، کتاب القاف۔ باب العین نسفی، کشف الاسرار، محولہ بالا ایڈیشن، ج ۲، ص ۴۰ ۲۵ ابن نجار۔ شرح الکوکب المنیر، محولہ بالا ایڈیشن، ج ۲، ص ۵۷۶ ۲۶ تفصیل کے لیے رجوع فرمائیں، سرخسی۔ اصول السرخسی محولہ بالا ایڈیشن، ج ۱، ص ۳۵۹-۳۷۴ ۲۷ احمد بن محمد الفیومی۔ المصباح المنیر۔ بیروت مکتبہ لبنان ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۱ ۲۸ حسام الدین۔ الحسامی مع النامی محولہ بالا ایڈیشن، ج ۱، ص ۱۵۱۔

تذکرۃ المحدثین اول، دوم وسوم

اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے آٹھویں صدی ہجری تک مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کے حالات و سوانح اور علم و فن حدیث میں ان کی خدمات تفصیل بیان کی گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ محدثین نے کس جانکاہ محنت اور کتنی تحقیق و احتیاط کے ساتھ حدیثوں کو جمع و مرتب کیا اور ان کے رد و قبول اور صحت و سقم کے جانچنے اور رواۃ کی جرح و تعدیل کے اصول بنائے۔ تیسری جلد ہندوستانی مفسرین کے متعلق ہے۔

قیمت جلد اول ۵۰ روپے، دوم زیر طبع۔ سوم ۵۵ روپے۔

"ینجر"

ایک علمی تنازعہ

از

مولانا عبداللہ عمادی مرحوم

* بیسویں صدی کے اوائل میں علم و ادب کے افق پر جو لوگ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور جن کی روشنی سے ابھی تک علمی دنیا منور ہے ان میں مولانا عبداللہ عمادی کا نام بڑا اہم ہے، انہوں نے مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی اور ان کے مطبع اصح المطابع سے اردو عربی رسالہ "البیان" نکالا، یہیں مولانا شبلی کی خدمت میں باریاب ہوئے تو انہوں نے الندوہ کا سب اڈیٹر بنایا، وکیل امرتسر، الہلال کلکتہ اور زمیندار لاہور سے بھی وابستہ رہے اور آخر میں حیدرآباد کے دارالترجمہ سے تعلق ہوا اور عمر بھر ترجمہ و تالیف کا کام انجام دیتے رہے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ مولانا عمادی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون ہم کو جناب اسمٰعیل اطہر عمادی بن مولانا ابراہیم عمادی ندوی مرحوم نے مولانا عبداللہ عمادی کی حقیقی پوتی سیدہ لطیفہ عمادی صاحب سے حاصل کرکے ہم کو بھیجا ہے، جس کو ہم ان دونوں کے شکریے کے ساتھ قارئین معارف کی نذر کررہے ہیں، اسمٰعیل عمادی صاحب نے آئندہ بھی معارف کے لیے اس طرح کی علمی سوغاتیں بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔

"ض"

کجوری نے ایک کتاب "تاریخ ریاضی" میں لکھا ہے:

"یہ بات عربوں کے مقدر میں تھی کہ وہ یونانی علوم و فنون کے محافظ و علمبردار رہیں اور مابعد بھی اس شمع کو روشن رکھیں۔ پھر بالآخر اسے اہل یورپ کو سونپ دیں۔ اس طریقے سے علوم و فنون آریائی نسل سے شامی نسل میں منتقل ہوئے اور پھر ان سے آریاؤں کو بازگشت ہوئے"[1]

اس بیان کا ماحصل یہ ہے کہ عربوں نے تمام علوم و فنون یونانیوں سے حاصل کیے ہیں جن کا تعلق آریائی نسل سے تھا اور جس وقت وہ (عرب) رخصت ہوئے تمام علوم و فنون اہل یورپ کو دے گئے جو آریائی نسل سے تھے۔ اب اسی بیان پر ہم قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس کی کتاب "تاریخ ہیروڈوٹس" سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ہیروڈوٹس چھٹی صدی قبل مسیح میں گذرا ہے۔ اس نے اس زمانے کی آباد اور مہذب دنیا کے حالات اپنی کتاب "تاریخ ہیروڈوٹس" میں جمع کیے ہیں. خصوصاً ایران، بابل، مصر و یونان کے حالات و واقعات اور ان کے باہمی تعلقات نہایت شرح و بسط سے بیان کیے ہیں جو آج بھی اہل بصیرت کے لیے باعث عبرت ہیں۔ یہ کتاب نو جلدوں پر مشتمل ہے اور بقول ایچ۔ جی۔ ولس (H. G. WELLS) اس کی اس تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ یونانیوں کو ان کے اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر انہیں جہانگیری اور جہاں بانی پر آمادہ کرتے۔ مصنف کا یہ خواب تقریباً دو سو سال بعد پورا ہوا۔ جب سکندر اعظم

[1] کجوری، تاریخ ریاضی، ص ۹۹۔

نے اپنے حملوں سے ہندوستان تک تمام ممالک فتح کر لیے اور ایران پر یونان کا سکہ بٹھا دیا۔ مصنف کا پایہ اتنا ارفع ہے کہ اہل یورپ اسے ابوالآباء تاریخ (FATHER OF HISTORY) مانتے ہیں اور مستند جانتے ہیں۔

ہیروڈوٹس کتاب کی پانچویں جلد میں حسب ذیل تحقیق پیش کرتا ہے:

"جفیری خود اپنے بیان کے مطابق آرٹیریا کے باشندے ہیں لیکن تحقیقات سے مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ وہ لوگ ان فنیقیوں میں سے تھے جو قادموس (CADMIANS) کے ساتھ اس خطہ میں وارد ہوئے جن کو اب بیوٹا (BEAOTIA) کہتے ہیں اور وہ علاقہ تناگرا میں جا بسے جو ان کے حصے میں آگیا۔

"فنیقی جو قادموس کے ساتھ آئے تھے انہیں میں جفیری بھی تھے اور جب انہوں نے اس ملک کی بود و باش اختیار کر لی تو یونانیوں نے متعدد مفید علوم رائج کیے خصوصاً حروف تہجی جن سے اہل یونان ناآشنا تھے۔ اولاً ان کا رسم الخط فنیقی تھا لیکن رفتہ رفتہ حروف کی شکل کے ساتھ ان کا تلفظ بھی بدلتا گیا۔ اس زمانہ میں آیونی یونانی، فنیقیوں کے قرب و جوار میں آباد تھے۔ انہوں نے فنیقیوں سے حروف تہجی سیکھ کر اس میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ ان بدلے ہوئے حروف کا نام "فنیقی" رکھا کیونکہ فنیقیوں نے ہی اسے یونان میں رائج کیا تھا"[1]

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فنیقیوں کی آمد سے پہلے سرزمین

[1] ہیروڈوٹس، جلد ۵، ص ۵۷-۵۸۔

یونان میں لاعلمی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ لکھنا پڑھنا تو کجا حروف تہجی بھی ان کے پاس نہ تھے۔ فینقی جب یونان میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی زبان کے حروف ان میں رائج کیے اور ان کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔ بالفاظ دیگر یونانیوں میں فینقیوں کا داخلہ بحیثیت معلمین تھا نہ کہ متعلمین کی حیثیت سے۔

محققین یورپ کی توضیح سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں یونانیوں میں دائیں سے بائیں لکھنے کا رواج تھا۔ عرصہ دراز بعد انہوں نے بائیں سے دائیں لکھنا شروع کیا۔ صوتی اعتبار سے یونانی حروف تہجی عربی سے بہت مشابہ ہیں مثلاً عربی کا "الف" یونانی "الفا"، "ب" "بیٹا" اور "ج" "گاما" ہوگیا۔ صدیاں گزرنے کے باوجود ان میں فینقی اثرات نمایاں ہیں۔ انگریزی حروف تہجی یونانیوں سے ماخوذ ہیں اور عربی اثرات کے حامل ہیں مثلاً:

ابجد   کلمن   قرشت

اب ج د، ک ل م ن، ق ر ش ت، ABCD, KLMN, QRST

امریکہ کے ایک ایک پروفیسر ہاگبین کی کتاب MATHMETICS FOR THE MILLION اس بلند پایہ کی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی مایہ ناز تصنیف ڈسکوری آف انڈیا DISCOVERY OF INDIA میں جا بجا اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ طالیس اور فیثا غورث TALIS AND PYTHAGOROS یونانی ریاضی کے دو قدیم اور جید عالم تھے۔ یہ دونوں فینقی نسل سے تھے۔ اب ہیروڈوٹس کے ان مذکورہ بالا الفاظ "فینقیوں نے یونان میں بہت سے علوم رائج کیے" پر روشنی پڑتی ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ فینقی ہی تھے جنھوں نے یونانیوں کو ریاضی سکھائی۔ ذیل میں

طالیس اور فیثا غورث کے مختصر کارنامے درج ہیں:

طالیس فینقی الاصل تھا[1] ملیطوس کا رہنے والا تھا۔ ۶۴۰ ق م تا ۵۴۶ ق م زندہ رہا۔ اس کا شمار ہفت یگانۂ روزگار میں ہوتا تھا۔ ایونی مکتب کا بانی بھی تھا۔

کسوف شمس [SOLAR ECLIPSE]

۵۸۵ ق م کا واقعہ ہے جب لیدیا اور میدیا کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا تھیں۔ روز روشن کا سماں تھا۔ گھمسان کا رن پڑا تھا۔ یکایک تاریکی پھیلنی شروع ہوگئی اور اندھیرا چھا گیا۔ آسمان پر تارے نکل آئے طرفین نے گھبرا کر جنگ روک دی اور صلح ہوگئی۔ طالیس نے اس کامل سورج گہن کی پیشینگوئی ایک سال قبل ہی کردی تھی[2]

اہرام مصر کی بلندی

طالیس کا سب سے بڑا کارنامہ اہرام مصر کی ارتفاع کی پیمائش ہے۔ فرعون مصر رعمیس کی موجودگی میں اس نے اس کا مظاہرہ کیا۔ یہ اہرام ایک اونچے چبوترے پر بنا ہوا ہے جس کا قاعدہ مربع ہے۔

شکل نمبر ۱

شکل نمبر ۲

۱۔ ہیروڈوٹس، جلد ۱، باب ۱۷ ۲۔ ایضاً باب ۷۴۔
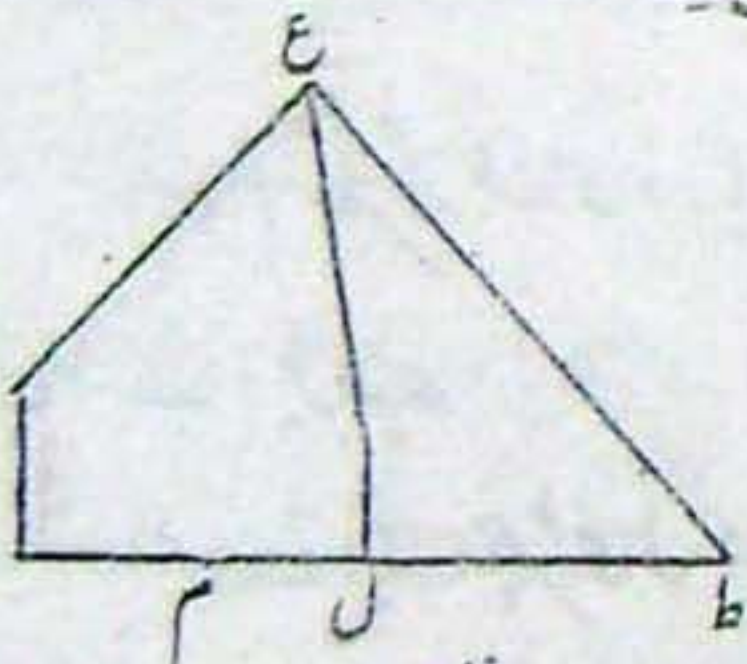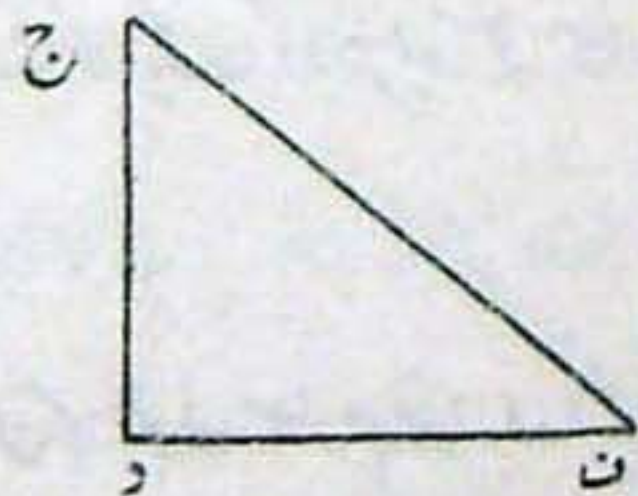
فرض کرو کہ صبح کو کسی وقت اہرام کی چوٹی کا سایہ نقطہ ط تک پڑتا ہے۔
(شکل ملاحظہ ہو) لہذا پورے سایہ کا طول اہرام کے نصف چبوترے کے طول خط
ل م + ل ط کے برابر ہوگا اور فرض کرو کہ اہرام کا ارتفاع سطح چبوترے سے
چوٹی تک ع ہے۔ طالیس نے خطوط مستقیم ل م اور ط ل کے طول کا حاصل جمع
(یعنی ط م) ناپ لیا اور اس وقت جب اہرام کا سایہ نقطہ ط پر تھا اس نے ایک
پیمائشی چھڑی ج د جس کا طول معلوم تھا زمین پر عموداً نصب کی۔ اوپری سرے
ج کا سایہ زمین کے نقطہ ف پر پڑتا ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۲) اس نے اس سایہ
کے طول د ف کو بھی ناپ لیا۔ اب اصول تناسب کے مطابق اہرام کی بلندی ع
کو اس کے سایہ ط م کے ساتھ وہی نسبت ہوگی جو پیمائشی چھڑی ج د کو اس کے
سایہ د ف سے ہے۔

یعنی بلندی ع / ط م = ج د / د ف

ع = (ج د × ط م) / د ف

اہرام مصر کی بلندی دریافت کرنے کا ایک اور طریقہ جو اسی سے منسوب
ہے حسب ذیل ہے:
اس نے ایک چھڑی لی (ج د) جس کا طول معلوم تھا اور اس کو زمین پر
نصب کیا۔ جس وقت چھڑی کا سایہ د ف چھڑی کے طول کے برابر ہوا اس
نے اہرام کا سایہ (د + ب) ناپ لیا۔ یہ طول اہرام کے ارتفاع کے برابر ہوا۔

(شکل نمبر ۲) طالیس نے فرعون کے سامنے جب اہرام کے ارتفاع کی پیمائش کی تو تمام
درباری اور خود عمیس حیرت میں پڑ گئے۔[1]
اس پیمائش سے اندازہ ہوتا ہے کہ طالیس کو نسبت اور تناسب کے اصول اور
متشابہ مثلثات CORRESPONDING TRIANGLES کے خواص سے
بخوبی واقفیت تھی وہ جانتا تھا کہ متساوی الزاویہ مثلثات مشابہ ہوتے ہیں یعنی
ان کے نظیری اضلاع ایک ہی نسبت میں ہوتے ہیں۔
طالیس پہلا شخص ہے جس نے بتایا کہ مثلث متساوی الساقین ISOSCELES
TRIANGLES کے قاعدے پر کے زاویے مساوی ہوتے ہیں اور اگر کسی
مثلث کا ایک ضلع دوسرے مثلث کے ایک ضلع کے مساوی ہو اور ان کے
مساوی ضلعوں کے سروں پر کے زاویے بھی مساوی ہوں تو یہ مثلثات ہر طرح
مساوی (IDENTICALLY EQUAL TRIANGLE) ہوتے ہیں۔
طالیس ہی نے دریافت کیا کہ قطر DIAMETER دائرہ کو دو مساوی حصوں
میں تقسیم کرتا ہے اور نصف دائرہ کے اندر کے تمام زاویے قائمہ ہوتے ہیں
وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مثلث کے تینوں زاویے دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں
الغرض طالیس ہی علم ہندسہ کا موجد ہے جو فنیقی قوم کا ایک رکن رکین اور
فرد فرید تھا۔ بلاشبہ مصریوں کو بھی ان میں کی چند باتوں کا علم تھا لیکن انکی
معلومات استدلال و ضوابط سے قاصر تھیں۔ طالیس نے ان کو علمی زبان میں
پیش کیا اور ان میں سے ہر ایک کا ثبوت دیا۔

---

[1] تاریخ ریاضی۔ گجوری ص ۱۹۔

کسوف شمس کی پیش گوئی اور اہرام کی بلندی کی پیمائش سے پتہ چلتا ہے کہ طالیس وہ پہلا شخص ہے جس نے علم ہندسہ کو فطرت کے قوانین کے مطالعہ اور روزمرہ کی زندگی میں استعمال کیا۔

فیثاغورث (PYTHAGORAS)

سا موس کا باشندہ تھا ۵۸۰ تا ۵۰۰ ق م زندہ رہا، طالیس کی زیارت سے شرفیاب ہوا اور اسی کے مشورے پر اس نے مصر جاکر کئی علوم سیکھے، غالباً بابل بھی گیا تھا پھر وطن واپس آیا تو اس کی ناقدری ہونے لگی تو اس نے کروٹن CROTON (جنوبی اٹلی) میں اقامت اختیار کرلی اور وہاں اپنا ایک مشہور ادارہ قائم کیا جس میں نہ صرف فلسفہ، ریاضی اور سائنس کی تعلیم ہوتی تھی بلکہ یہ ایک طرح کی برادری تھی جس کے ارکان زندگی بھر کے لیے آپس میں متحد رہنے کا حلف اٹھاتے تھے۔ ان کو اسی مکتب کے اصول اور تحقیقاتی سرگرمیوں کو دوسروں تک پہونچانے کی ممانعت تھی وہ اپنی تحقیقات کو ادارہ کے بانی (یعنی فیثاغورث) سے منسوب کرتے تھے اس ادارہ نے بہت جلد ترقی حاصل کرلی اور زبردست سیاسی اہمیت کا حامل بن گیا۔ رفتہ رفتہ اس ادارہ کے متعلق ملک میں مختلف بدگمانیاں پھیلی گئیں وہاں کی تمام عمارتیں تباہ کر دی گئیں اور بالآخر ادارہ بند ہوگیا۔ حتیٰ کہ فیثاغورث نے بھاگ کر طارنطوم میں پناہ لی۔ وہاں بھی اسے سکون نہ مل سکا وہ شہر شہر پھرتا رہا۔ آخر کار مخالفین نے اسے قتل کر دیا۔

فیثاغورث نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اس عظیم ماہر العلوم کے ادارے میں ریاضی کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ فیثاغورث نے ہی

ریاضی کو علمی حیثیت بخشی۔ حساب ہی پر اس کے فلسفیانہ نظام کی بنیاد قائم تھی فیثاغورث ہی سے یہ اہم مسئلہ منسوب ہے کہ مثلث قائم الزاویہ میں وتر کا مربع باقی دو اضلاع (ارتفاع و قاعدہ) کے مربعوں کے مجموعے کے برابر ہوتا ہے۔

$$\text{وتر}^2 = \text{ارتفاع}^2 + \text{قاعدہ}^2$$

اس مسئلہ کی تصدیق خاص صورت میں جبکہ اضلاع ۳، ۴، ۵ (قاعدہ، ارتفاع، وتر) کی نسبت میں ہوں، اس نے غالباً مصریوں سے سیکھی ہوگی۔ ورنہ ہر مثلث قائم الزاویہ کے لیئے اس حقیقت کا ثابت کرنا فیثاغورث ہی کا کام تھا۔

اس مسئلہ کے سلسلہ میں اس نے ایک ضابطہ دریافت کیا جس کی مدد سے ایسے اعداد معلوم کیے جا سکتے ہیں جن میں سے دو کے مربعوں کا مجموعہ تیسرے عدد کے مربع کے برابر ہو جبکہ وتر اور زاویہ قائمہ کے گھیرنے والے اضلاع کا فرق ایک ہو۔

مثلث قائم الزاویہ کے مطالعہ کے وقت مشاہدین کو کئی عجیب و غریب باتیں دیکھنے میں آئی ہوں گی۔ مثلاً مساوی الساقین مثلث ISOCELES E TRIANGLE۔ کا ایک ضلع معلوم ہو تو وتر دریافت کرنا۔ لیکن ہر صورت میں بلا کسی استثنا کے وتر کے لیے کوئی صحیح عدد INTEGER دریافت کرنے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوں گی۔ ایسے ہی کسی طریقے سے غیر صحیح مقادیر کا نظریہ (THEORY OF IRRATIONAL QUANTILIES)

وجود میں آیا ہو گا۔ یوڈیموس (EUDEMUS) نے جو ارسطو کا شاگرد تھا۔ یونانی علم ہندسہ کی تاریخ مرتب کی تھی جو ضایع ہو گئی۔ لیکن اس کے جستہ جستہ اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ غیر صحیح مقادیر کی ایجاد اسی فیثاغورث کی رہین منت ہے۔ یقیناً اس خیال میں غیر معمولی جسارت پائی جاتی ہے کہ ایسے خطوط مستقیم ہو سکتے ہیں جو نہ صرف طول یعنی کمیت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں بلکہ اس کیفیت میں بھی جو اگرچہ کہ بالکل حقیقی۔ MATERIALISTIC۔ ہو مگر مطلقاً غیر مرئی INVISIBLE ہو مثلاً خیالی خط مستقیم۔ IDIAL LINE۔ کا عرض اور چوتھا ابعاد (4TH DIAMENSION) وغیرہ

فیثاغورث اور اس کے ساتھیوں نے اعداد کو دو حصوں طاق و جفت (ODD AND EVEN NUMBERS) میں تقسیم کیا۔ اس نے بتایا کہ طاق اعداد کا سلسلہ ۱ + ۳ + ۵ + ... + (۲ن + ۱) تک ہمیشہ کامل مربع رہتا ہے۔ یعنی ہندسہ ا سے شروع کرتے ہوئے مسلسل کتنے بھی طاق اعداد لیے جائیں حاصل جمع ہمیشہ کامل مربع ہو گا۔

مثال: ۱ + ۳ + ۵ + ۷ = ۱۶ جو ایک کامل مربع $۴^۲$ ہے۔

اسی طرح جفت اعداد کے سلسلہ کے مجموعے سے ایسے دو اجزائے ضربی حاصل ہو سکتے ہیں جن کا فرق ۱ ہو۔ مثلاً

۲ = ۲ × ۱

۴ + ۲ = ۶ = ۳ × ۲

۶ + ۴ + ۲ = ۱۲ = ۴ × ۳

فنیقی کون تھے اس سوال کا جواب یورپی محققین کی زبانی سنیے۔ پروفیسر رالن سن نے "تاریخ فنیقیہ" مرتب کی تھی جو ۱۸۸۹ء میں لانگمینس گرین اینڈ کو لندن سے چھپی ہے۔ پروفیسر صاحب کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"یونانیوں نے ابتداً بحر روم کے اس ساحلی علاقہ کو فنیق یا فنیقیہ کا نام دیا جو مغرب کی جانب بتیسویں اور چھتیسویں متوازی خطوط کے درمیان واقع ہے، رومیوں نے بعد میں یہی نام "فنیقیہ" اختیار کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہومر HOMERIE سے بھی پہلے کے زمانہ میں قدیم یونانی اپنی جہاز رانی کے دوران ایک ایسے خطہ ارض پر وارد ہوئے جہاں کھجور کا درخت نہ صرف قدرتی طور پر بلکہ پست ریتیلے سواحل پر بھی اگتا تھا۔ انکے بالدار پتیوں کا گچھا انجیر انار اور زیتون کے چھوٹے چھوٹے درختوں سے زیادہ اونچا نظر آتا تھا۔ لہذا انہوں نے اس کا نام "فنیقیہ" یا کھجوروں کا ملک رکھ دیا اور یہاں کے باشندوں کو فنیقی کہنے لگے"[1]

اس صراحت سے صاف ظاہر ہے کہ "فنیقیہ" یونانی زبان کا لفظ ہے۔ نہایت قدیم زمانے میں جس کی تاریخ غار گمنامی میں پوشیدہ ہے۔ یونان اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر بحر روم کے ساحلی علاقہ آ پہونچے۔ یہاں انہیں کھجور کے اونچے اونچے درخت نظر آئے۔ انہیں یہاں کے لوگوں کی سربلندی کا مشاہدہ ہوا اور وہ انہیں اپنی زبان میں فنیقی کہنے لگے۔ بعد ازاں رومیوں میں بھی یہی نام رائج ہو گیا۔

---

[1] تاریخ فنیقیہ رالن سن HISTORY OF PHENICIA BY RAWLINSUN

آگے چل کر پروفیسر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ اہل فینقہ کا شمار سامیوں SIAM-ESE میں ہوتا ہے جن میں اہل اشور، اہل بابل BABY LONIANS آرامی، یا شامی، عرب MOABILES اور عبرانی HEBREWS شامل ہیں۔ ان تمام قوموں کی امتیازی خصوصیت انکی مشترک زبان ہے جو قدرے اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ عرب اہل فینیقیہ کو "عمالقہ" کہتے ہیں۔ ابتداً یہ لوگ خلیج فارس کے ساحل پر آباد تھے۔ وہاں سے ترک وطن کر کے انہوں نے شام کے ساحلی علاقہ کو اپنا مسکن بنایا۔ صور (TYRE) اور صیدہ (SIDON) ان کی دو مشہور بستیاں تھیں جو اہم تجارت گاہ تھیں۔ مابعد بحر روم کے تمام جزائر ان کے قبضہ میں آگئے، اور یورپ و افریقہ کے ساحلی علاقہ پر جابجا ان کی نوآبادیاں قایم ہوگئیں، ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں انکی تجارت کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے ان کی صداقت اور راستبازی کا پتہ چلتا ہے۔[1]

اب کجوری کے مذکورہ الفاظ پر غور کیجئے! وہ ہیں: "عربوں نے یونانیوں سے جو آریائی نسل سے تھے علوم و فنون حاصل کیے اور ان کی محافظت کی" کہاں تک درست ہے؟ یہاں سوال یہ ہے کہ یونانیوں کے پاس وہ کون سے علوم تھے جو عربوں نے ان سے حاصل کیے؟ حق تو یہ ہے کہ یونانیوں کو فینیقیوں کی بدولت بہت کچھ حاصل ہوا۔ طالیس، فیثاغورث اور ان کے شاگردوں نے یونانیوں کو ریاضی، ہیئت اور دوسرے علوم سکھائے اور یہ لوگ سامی تھے جن کی ایک شاخ عرب ہیں: اس بیان کا ماحصل یہ ہے کہ عربوں نے ریاضی میں یونانیوں سے جو کچھ لیا وہ خود انہیں کے اسلاف کا ورثہ تھا۔ ورنہ آریائی نسل کے پاس کیا تھا جو وہ لیتے۔

این گفت سحر گہ گل بلبل تو چہ می گوئی

---

[1] راولنسن، تاریخ فینیقیہ، ص ۴۹۔

بنارس کا ایک فارسی گو شاعر ملا سابق

از

ڈاکٹر شمیم اختر۔ بنارس

مغلوں کی آمد سے پہلے ہی بنارس فارسی زبان سے آشنا ہو چکا تھا۔ مگر شیخ علی حزیں کی بنارس میں سکونت پذیری کے بعد یہ شہر فارسی زبان و ادب کا مرکز بن گیا۔ ایران کا یہ جلاوطن شاعر اپنی وطنی نخوت و عصبیت اور ہندی طرز معاشرت اور تمدن سے بیزاری اور اپنے مزاج کی تیزی و تندی کے سبب جب دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوا تو وہ بنارس آیا۔ یہاں کے مہمان نواز دلدادگان علم و ادب نے حزیں سے بے التفاتی نہیں برتی بلکہ ملک کے اطراف و جوانب سے لوگ اس کی قیام گاہ فاطمان میں آکر اس کی ہم نشینی میں رہتے اور اس سے استفادہ کرتے۔ جو ممتاز صاحبان علم و فضل اس کے دامن سے وابستہ ہوئے ان میں بٹالہ کے نورالعین واقف، عبدالحکیم حاکم لاہوری، بندرابن داس خوشگو وغیرہ شامل ہیں۔ خود بنارس کے اصحاب علم و ذوق بھی اس سے فیضیاب تھے، جن میں ممتاز نام ملا محمد عمر سابق بنارسی کا ہے۔

بنارس میں حزیں اپنی قیام گاہ چھوڑ کر دوسروں کے یہاں کم آمد و رفت رکھتے تھے، مگر ملا سابق بنارسی اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے۔ ان کے اجداد بخارا سے

ہندوستان آئے تھے۔ ملا کی پیدائش بنارس میں ۱۱۳۳ھ میں ہوئی تھی محلہ کٹوا پورا
میں وہ اپنے رہائشی مکان میں سکونت پذیر تھے۔ آج بھی ان کے خاندان کے جناب
عبدالغفور فاروقی صاحب ریٹائرڈ اڈیشنل جج اس مکان میں رہتے ہیں۔

ملا کی ذہانت حیرت انگیز تھی وہ کتب درسیہ کی تعلیم بہت جلد مکمل کرکے
مزید حصول علم کے لیے دہلی چلے گئے جہاں انہوں نے منطق و حکمت، ریاضی و فقہ
علم معانی و بیان وغیرہ کی تحصیل کی اور صحیح معنیٰ میں ملا کہلانے کے مستحق ہوئے۔

دہلی میں ملا سابق کو سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا الف بیگ شیرازی
کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا اور وہ خان آرزو کے حلقہ تلمذ میں داخل
ہوگئے جس کا اعتراف انہوں نے اپنی ایک مشہور مثنوی "سوز و گداز" میں نہایت
ادب سے کیا ہے:

سخن را گشت پیدا دستگاہ — زفیض مدحت معنی پناہ
جہان فیض را خورشید انور — سراج ملت و دین پیمبر

اس مثنوی کے دیگر چھ اشعار میں بھی ملا سابق نے خان آرزو کے کمال
و وصف کا ذکر کیا ہے اور پھر مرزا الف بیگ شیرازی کی طرف متوجہ ہوکر
کہتے ہیں:

زمدحش قاصر آمد چون زبانم — بوصف میرزا گوہر فشانم
الف داری کہ آمد بی کم و کاست — براہ حق سلوکش چون الف راست

ملا سابق کے اجداد ہندوستان میں مقتدر عہدوں پر فائز ہوئے۔
خود ان کے والد غوث محمد بھی قاضی تھے۔ ملا سابق متقی پرہیزگار اور اوصاف حمیدہ

کے مالک شخص تھے، انہوں نے جب بنارس میں اپنا مکان تعمیر کرایا تو اس میں ایک
مسجد بھی بنوائی۔ بڑے منکسر المزاج تھے۔ جب ان کے استاد خان آرزو نے
لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کی ملازمت کے دوران وفات پائی تو نواب
مذکور نے ملا سابق کو خان آرزو کا جانشین مقرر کرنا چاہا مگر ملا نے ازراہ
انکسار عرض کیا:

دلا تا بزرگی نیارد بدست — بجای بزرگان نباید نشست

نواب نے معذرت قبول کی اور ملا سابق کے لیے ساٹھ روپیہ کا روزینہ
مقرر کر دیا جو انہیں تا دم آخر ملتا رہا۔

ملا محمد عمر سابق کے حالات میں ان کے پوتے مولوی عبدالقادر فاروقی مرحوم
نے ایک رسالہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں شایع کیا تھا، ان کا بیان ہے کہ انکے
دادا ملا سابق مرحوم نے طالب علمی کے زمانے میں اپنی عمر کا طویل حصہ سیر
و سیاحت میں بسر کیا۔ جہاں کسی صاحب علم و فن کی موجودگی کا علم ہوتا وہاں
پہنچ کر اس سے ملاقات کرتے اور فیض حاصل کرتے خود ملا سابق اپنی ایک
مثنوی قضا و قدر میں کہتے ہیں

چون ریحان شبابم تازہ تر بود — عنانم در کف شوق سفر بود
بمغرب رہنمون شد روزگارم — ربود از کف عنان اختیارم

سیر و سیاحت کا دور ختم ہوا تو مستقلاً بنارس میں سکونت پذیر ہوئے۔
جہاں ہر وقت طالبان علم و فن کا مجمع رہتا تھا جن کو ملا صاحب علم منطق، ریاضی
حکمت فقہ و تفسیر اور علم معانی و بیان کا درس دیتے تھے۔ ملا صاحب کو شاعری

کا فطری ذوق تھا۔ ان کا مسکن شعراء و صاحبان علم و فن سے معمور رہتا تھا، شعرا اپنا کلام سناتے اور مبتدی حضرات ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔

کثرت مطالعہ سے آخر عمر میں ملا سابق کی بصارت جاتی رہی تاہم شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا، ان کی بعض مثنویاں اسی دور کی یادگار ہیں جو اپنے شاگردوں کو بول کر لکھوائی تھیں۔

مشہور ہے کہ شیخ علی حزیں ہندوستان کے بڑے سے بڑے شاعر کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، مبارزۂ حزیں و آرزو کا سبب بھی یہی امر تھا، اسی لیے دہلی چھوڑ کر وہ بنارس آئے۔ اس کے باوجود حزیں نے ملا سابق بنارسی کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کیا ہے۔ ایک روز دونوں باکمال علمی و ادبی گفتگو میں منہمک تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے علی حزیں سے دریافت کیا کہ "گہیا کرامی گویند"۔ حزیں نے کہا "از ملا بپرس" ملا سابق نے برجستہ جواب دیا "قسمی است از پلاؤ" پھر اس کھانے کی کیفیت اور اس کے پکانے کا طریقہ بھی تفصیل سے بتا دیا۔ حزیں کو بڑی حیرت ہوئی، انہوں نے ملا صاحب سے پوچھا، آپ نے گہیا کھایا ہے؟ ملا نے کہا کھایا نہیں مگر اس کی کیفیت سے واقف ہوں، دوسرے روز حزیں نے "گہیا" پکوا کر ملا صاحب اور کچھ دیگر لوگوں کی دعوت کی۔

ملا سابق اور حزیں کے درمیان اچھے اور مخلصانہ روابط تھے، دونوں ایک دوسرے کے کلام سے محظوظ بھی ہوتے تھے اور اس کی ستائش بھی کرتے تھے، ملا سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد تھے، جن کے اور شیخ کے درمیان مبارزہ واقع ہوا تھا۔

اپنے استاد کی توقیر اور وطن کی عزت کے خیال سے حزیں اپنا کلام سناتے تو ملا سابق بھی اسی طرح میں غزل کہہ کر حزیں کو سناتے اور داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حزیں نے اپنی یہ مشہور غزل سنائی مطلع یہ ہے:

ای وای بر اسیری کز یاد رفتہ باشد　　در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

آہ از دمی کہ تنہا با داغ او چو لالہ　　در خون نشستہ باشم چو باد رفتہ باشد

خونش بتیغ حسرت یارب حلال بادا　　صیدی کہ از کمندت آزاد رفتہ باشد

از آہ و درد تا کی سازم خبر دلت را　　روزی کہ کوہ صبرم بر باد رفتہ باشد

رحمت بر اسیری کز گرد دام رافت　　با صد امید واری ناشاد رفتہ باشد

شادم کہ از رقیبان دامن فشان گذشتی　　کو مشت خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد

پرشور از حزیں ست امروز کوہ و صحرا　　مجنون گذشتہ باشد فرہاد رفتہ باشد

ملا سابق نے دوسرے روز اسی طرح میں غزل کہی اور حزیں کو سنائی:

جانش چسان بحسرت ناشاد رفتہ باشد　　کز لعبہ بر دل او بیداد رفتہ باشد

فرہاد وار رحمت بر بیدلی کہ او را　　با یاس جان شیرین بر باد رفتہ باشد

از خار زار امکان ہر کس کہ جہد داماں　　چون سرو زین گلستان آزاد رفتہ باشد

ای وای بر غریبی بایک جہان تمنا　　در وقت جان سپردن از یاد رفتہ باشد

سابق بسوز آور دایں مصرعہ حزینم　　مجنون گذشتہ باشد فرہاد رفتہ باشد

مولوی عبدالقادر نے ملا سابق کی حسب ذیل تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ تذکرہ گنج شائگان: اس تذکرہ میں ملا سابق نے ہند و ایران کے متقدمین شعراء سے لے کر اپنے ہم عصر شعراء و ادبا کا ذکر کیا ہے اور ان کے

کلام کا معتد بہ حصہ بھی نقل کیا ہے۔

۲- دیوان ملا سابق۔

۳- مجموعہ مثنویات: اس مجموعہ میں ملا سابق کی چھ مثنویاں شامل ہیں جن کے نام ہیں:

۱- مثنوی محمود و ایاز ۲- مثنوی شیریں خسرو ۳- مثنوی نل دمن ۴- مثنوی لیلی مجنوں ۵- مثنوی سوز و گداز ۶- مثنوی تاثیر عشق۔

ملا سابق کے نزدیک انسان کے اوصاف حمیدہ میں وفا شعاری ہی وہ وصف ہے جس سے انسان ممتاز ہوتا ہے۔ یہی خیال مثنوی محمود و ایاز کا محرک ہوا اور انھوں نے مثنوی مذکور کا آغاز ان اشعار سے کیا:

شبی سر رشتۂ فکرم رسا بود   سر من باگریبان آشنا بود

کہ آن وصف مکمل چیست در دہر   کہ مردم را دہد از نکوتی بہر

گرامی سازدش از جملہ خلقت   نماید پایہ اش عالی برتبت

کہ ناگہ آمد آوازی سروشم   رسانیدا این ندائی خوش بگوشم

ایاز از دنی غلامی شاہ محمود   وفا یارش شدہ با بخت مسعود

چو در عہد وفا گردید نامی   برغبت کرد سلطانش غلامی

ملا سابق عشق مجازی کو عشق حقیقی تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے چنانچہ اپنے اس مرکزی خیال کو شعری جامہ دینے کے لیے شیریں خسرو، لیلی مجنوں، نل دمن وغیرہ مثنویاں کہیں اور ہر مثنوی کا آغاز دعائیہ اشعار سے کیا ہے۔ مثنوی شیریں خسرو کے آغاز کے چند اشعار:

چمن پیرائی کلک نکتہ پرداز   سری دارد بسیر گلشن راز

کہ ہر صفحہ بنازد ہمچو شبدیز   نگارد قصۂ شیرین و پرویز

اور مثنوی نل دمن کے اشعار:

الٰہی نامہ را بخش تاثیر   کہ آرد ملک معنی را بہ تسخیر

ز سحر طبع سازم خامہ رانی   نگارم نقش از رنگ معانی

بنارس کی ایک مسجد میں دو قبریں ہیں جو عاشق و معشوق کی قبریں کہلاتی ہیں اور نہ صرف مسجد بلکہ پورے محلہ کا نام قبر عاشق و معشوق ہے اور یہ اندراج سرکاری کاغذات میں بھی ہے۔ مرزا غالب جب سفر کلکتہ کے دوران بنارس میں ٹھہرے تو ان کی قبروں کی زیارت کے لیے بھی گئے تھے۔ مشہور ہے کہ عاشق نامراد کے جذبۂ صادق کی آزمایش دریائے گنگ میں اس وقت ہوئی جب معشوقہ کی جوتی اس کی خادمہ نے دریا میں ڈال کر کہا اگر عشق صادق ہے تو دریا میں ڈوب کر جوتی نکال لائیے۔ عاشق دریا میں کود گیا۔ عاشق کا ڈوبنا دیکھ کر معشوقہ بھی کود پڑی اور دونوں لاشیں بغل گیر حالت میں ندی سے نکالی گئیں۔

ملا سابق نے اس واقعہ کو اپنی مثنوی "تاثیر عشق" میں نظم کیا ہے۔ آغاز کے سات شعر کے بعد بطور دیباچہ ۲۸ شعر، ۱۸ اشعار در صفت سخن، ۵۳ اشعار در سبب نظم کتاب کہنے کے بعد داستان کا آغاز اس طرح کیا ہے:

بیا کین داستان کہنہ را باز   ز نو بخشم گرامی زیور و ساز

اس مثنوی میں ملا سابق نے بنارس کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

چہ شہری آنکہ از حسن سرانجام   لطف حق بنارس یافتہ نام
چہ شہرا نتخاب ہفت کشور   ز روم مصر بردہ رونق و فر
ہوایش قوت روح و مایۂ جان   خریدارش بجان ہر انس و جان
چو از آب لطیفش آگہی یافت   خضر از آب حیوان روی تافت
بہر سویش چو جنت باغ دلکش   کہ داد از خرمی غم دیدہ رانجش
بہر سویش بسی گلہای ایوان   ندیدہ مثلش اندر خواب رضوان

ملا سابق نے غزلیں بھی لکھی ہیں، اس مقالہ میں چند اشعار بطور نمونہ درج کرتی ہوں:

مکن اعتمادی با اقبال دوران
بقای نباشد گل بوستان را

ہر کہ راضی بار ضا و با توکل می شود
خار گر ریزند اندر جیب و گل می شود

سیماب وار عاشق یکدم بجا نباشد
بے تابی دلش را ہرگز دوا نباشد

تا توانی خویش را از قید دہر آزاد کن
چون شرر اندر طلسم سنگ افسردن چرا

حیات سابق کے مولف مولوی عبدالقادر مرحوم نے ملا کا جو کلام جمع کیا تھا اسے انکے صاحبزادے خان بہادر نے بنارس کی مشہور دینی درسگاہ مظہر العلوم کی لائبریری میں حفاظت کے خیال سے دیدیا تھا مگر افسوس وہ ضایع ہوگیا۔ حیات سابق میں ملا کا جس قدر منتخب کلام شامل ہے اسکی مدد سے ایک مستقل مضمون تیار ہو سکتا ہے۔

شہاب

گجرات کا ایک اردو رسالہ

از
پروفیسر محبوب حسین عباسی

بیسویں صدی کے نصف اول میں گجرات سے اردو کے دو اہم ماہوار رسالے نکلے۔ پہلا 'زبان' (۱۹۲۶ - ۱۹۲۸ء) مانگرول سے اور دوسرا 'شہاب' (۱۹۳۴ء) جونا گڑھ سے۔ زبان کے مدیر ایک گمنام مگر نہایت علم دوست ادیب اور شاعر جناب عبدالرحمن خوشتر منگرولی تھے جو شعر بھی کہتے تھے اور بالم کے نام سے افسانے اور کہانیاں بھی لکھتے تھے جبکہ 'شہاب' کو اردو کے دو نامور محقق اور مصنف مولانا سید ابوظفر ندوی اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے اپنی نگرانی میں جاری کیا تھا۔ لیکن یہ دونوں رسالے معیاری ہونے اور عوام میں مقبول ہونے کے باوجود گوناگوں وجوہ سے دو سال یا اس سے بھی کم عرصے تک نکلنے کے بعد بند ہوگئے، یہی نہیں بلکہ گمنامی کا بھی شکار ہوگئے۔

مذکورہ بالا دونوں رسالوں کے بند ہو جانے کے قریب پچاس سال بعد ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی (سابق ڈائریکٹر، کتبہ شناسی، محکمۂ آثار قدیمہ ہند)

نے پہلی بار ان رسالوں کی طرف اردو داں طبقہ کی توجہ مبذول کرائی اور
ان ہی کی کوششوں سے زبان کا مکمل فائل خوشتر منگرولی سے حاصل
کیا گیا جو ۱۹۸۶ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے زیر اہتمام،
اردو ادب کی بازیافت کے سلسلے میں شایع ہو کر اردو داں طبقے میں
روشناس ہوا۔

زبان کے مکمل فائل کی اشاعت کے ساتھ ہی ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی
صاحب اس بات کے بھی متمنی اور کوشاں رہے کہ شہاب کا فائل بھی
زبان کی طرح شایع ہو جائے۔ اس کے لیے انہوں نے ہندو پاکستان
کے احباب کو خطوط لکھے۔ آخر کار خوشتر صاحب ہی نے انکو بتایا کہ شہاب
کا فائل بھی ان کے پاس ہے لیکن موصوف بڑھاپے میں اپنے بیٹوں کے
کے پاس ڈھاکہ (بانگلادیش) مقیم رہے اور وہیں ۱۹۸۸ء میں تقریباً سو برس کی عمر
میں ان کی وفات ہوئی، لہذا شہاب کا فائل نہ مل سکا۔ اس کے بعد ڈیسائی
صاحب کو اس بات کا پتہ چلا کہ خوشتر صاحب نے اپنی وفات سے پیشتر اپنی
ذاتی لائبریری کی تمام کتابیں منگرول کے دار العلوم حنفیہ کو وقف کر دی
تھیں اور اسی ذخیرہ میں شہاب کا فائل بھی موجود ہے۔ اس کا علم ہونے
کے بعد تقریباً ایک سال پہلے ڈیسائی صاحب نے منگرول کا سفر کیا اور
شہاب کا فائل بھی ڈھونڈ نکالا۔ لیکن چونکہ خوشتر صاحب نے اپنی کتابیں
اور رسالوں کے فائل مذکورہ دینی درسگاہ کو وقف کر دی تھیں اسلیے
شرعی مسئلہ کے تحت اب وہ کسی کو منتقل نہیں کی جا سکتیں۔ اسی بنا پر

ڈیسائی صاحب نے راقم الحروف کو ترغیب دلائی کہ میں منگرول جاؤں
اور شہاب کے فائل کی فوٹو کاپی نکلوا کر لاؤں۔ چنانچہ مئی ۱۹۹۶ء میں
دار العلوم حنفیہ کے مہتمم صاحب اور ناظم کتب خانہ نے فوٹو کاپی نکلوانے
کی غرض سے شہاب کا فائل عنایت کیا۔

ذیل کا مقالہ شہاب کے اسی فائل پر مبنی ہے جو محترم ڈیسائی صاحب کا
مرہون منت اور انکی ترغیب و تشویق کا نتیجہ ہے۔ محبوب عباسی]

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ بہار کی جانب سے ۱۹۸۶ء میں
اردو ادب کی بازیافت کے سلسلے میں گجرات کے ماہنامہ "زبان" منگرول
(۱۹۲۶-۱۹۲۸ء) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت عمل میں آئی تھی[1]۔ اس سے
ماہنامہ 'زبان' اور اس کے ایڈیٹر عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی (۱۸۹۲-۱۹۸۸)
کی خدمات منظر عام پر آئی تھیں اور اردو دنیا کو ان کا تعارف حاصل ہوا تھا۔
۱۹۲۸ء میں رسالہ زبان کی موقوفی کے بعد مولانا سید ابو ظفر ندوی[2]
(متوفی ۱۹۵۸) اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی[3] (متوفی ۱۹۵۵) نے شہاب
نام کا اردو ماہنامہ جوناگڑھ (گجرات) سے جنوری ۱۹۳۴ء میں جاری کیا
تھا۔ اس کا ایک فائل جس میں جنوری سے اگست ۱۹۳۴ء تک کے آٹھ
شمارے شامل ہیں اور جو منگرول (ضلع جوناگڑھ، گجرات) کے دار العلوم
حنفیہ میں محفوظ ہے، یہ بھی خوشتر منگرولی کی ذاتی ملک ہے جسے ان کی
وصیت کے مطابق ان کی وفات سے پہلے ان کے وطن کے دار العلوم کو
دیگر کتابوں اور رسالوں کے ہمراہ وقف کر دیا گیا تھا۔ اس فائل کے شمارہ

اول جنوری ۱۹۳۴ء کے ورق ایک پر خوشتر صاحب کے مختصر انگریزی دستخط A.R.K. مندرج ہیں، نیز شمارۂ اول و آخر جنوری اور اگست ۱۹۳۴ء کے ورق ایک پر آپ کی انگریزی مہر A.R. KHUSHTAR

SAIYADWADA

MANGROL (SAURASHTRA)

بھی لگی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ پہلے شمارہ کے سرورق پر خود خوشتر صاحب کے اپنے خط میں "ذاتی لائبریری" اور مندرجہ بالا مختصر دستخط کے حروف ARK لکھے ہوئے ہیں۔

رسالہ شہاب کے دونوں مدیر سید ابوظفر ندوی اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی ہند و پاکستان کے علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دونوں کو اردو زبان اور گجرات کی تاریخ و ثقافت سے محبت تھی۔ خوشتر منگرولی سے دونوں کے دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں خوشتر منگرولی کی زیر ادارت زبان کی اشاعت کے موقع پر قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے فارسی میں "تاریخ اجرائے رسالۂ زبان" کے عنوان سے قطعۂ تاریخ کہہ کر اپنی خوشی کا اظہار ان لفظوں میں کیا تھا:

تعالی اللہ کہ شد دور فلک آخر بکام ما	بر آمد از پسِ مدت تمنائے دلِ اختر
چہ خوش وقتی و خرم روزگاری رو نمود اکنون	کمر بستہ باجرار رسالہ حضرتِ خوشتر
دعا دارم ورا ایزد بقای جاوداں بخشد	شود از جملہ اردو رسائل افضل و برتر

پئی تاریخ اجرای رسالہ فکر می کردم
سروشم داد این مژدہ "زبان دلکش و خوشتر"
۱۹۲۶ء

قاضی احمد میاں اختر اور سید ابوظفر ندوی نے 'زبان' کی اشاعت کی پوری مدت میں اپنے مضامین اور تحریروں کے ذریعے نیز اپنے دوست احباب کے نام رسالہ جاری کرواکر خوشتر منگرولی کی پوری مدد کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ یہ دونوں حضرات زبان کے مدیر کو خط لکھ کر کارآمد مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے اور زبان کی اشاعت جاری رہنے کے لیے ہمیشہ فکر مند اور کوشاں بھی رہتے تھے۔ خوشتر منگرولی کو ان دونوں حضرات کی طرف سے لکھے گئے خطوط اس حقیقت کے گواہ ہیں[5]۔ زبان کی اشاعت کے سلسلے میں قاضی احمد میاں اختر کی کوششیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں اور گجرات کے پہلے اردو رسالے کے ساتھ انہیں ایسا دلی لگاؤ تھا کہ انہیں حکومت جوناگڑھ کی جانب سے اس کی قلمی معاونت سے روک دیا گیا تھا،[6] تاہم خفیہ طور پر اس کی مدد کرنے سے انہوں نے کبھی گریز نہیں کیا۔ یہی حال مولانا سید ابوظفر ندوی کا بھی تھا۔ وہ گجرات میں ہوں یا سفر میں یا اپنے وطن بہار گئے ہوئے ہوں ہمیشہ اسی فکر میں رہتے تھے کہ زبان کے لیے لکھنے والے اور زبان کو خریدنے والے مہیا کرتے رہیں۔ سید ابوظفر ندوی دار المصنفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڈھ سے بھی مواعید لیتے رہتے تھے[7]۔

۱۹۲۶ء میں زبان کے بند ہوجانے کے بعد بھی ان دونوں حضرات کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ زبان کا احیاء ہوجائے اور یہ پرچہ پھر سے منظر عام پر آئے۔ اس کے لیے خوشتر صاحب کو ہر خط میں یاد دہانی بھی کراتے رہتے تھے اور ترغیب بھی دلاتے رہتے تھے۔

بالآخر جب خوشتر صاحب کی بے انتہا کوشش کے باوجود زبان کا دوبارہ

اجرا نہ ہوا تو سید ابوظفر ندوی احمد آباد سے اردو رسالہ نکالنے کے امکانات کا جائزہ لینے لگے اور ۱۹۳۱ء میں انہوں نے ایک ایسا اردو دوست بھی ڈھونڈ نکالا جو پرچہ نکالنے کے لیے تیار تھا۔ اس اسکیم کا کیا حشر ہوا اس سے تو بظاہر اب کوئی واقف نہیں البتہ سید ابوظفر ندوی کو قاضی صاحب کا تعاون حاصل ہوا اور دونوں نے مل کر جوناگڑھ سے جنوری ۱۹۳۴ء میں "شہاب" کی اشاعت شروع کر دی۔

جنوری ۱۹۳۴ء سے اگست ۱۹۳۴ء تک ماہوار رسالہ شہاب آگرہ اخبار پریس آگرہ میں طبع ہو کر راجکوٹ دفتر شہاب سے شایع ہوتا رہا۔ شہاب کے پہلے پانچ شماروں کے سرورق پر یہ اشتہار چھپا ہوا ہے کہ اسے راجکوٹ دفتر شہاب سے شایع کیا گیا اور جون، جولائی اور اگست کے شماروں پر شہاب کا دفتر کنگ روڈ جوناگڑھ پر ہونا درج ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی اشاعت کا مرکز جوناگڑھ ہی تھا اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی اس کے روح رواں تھے۔ سید ابوظفر ندوی شہاب کے پہلے شمارے بابت جنوری ۱۹۳۴ء کے ابتدائی کالم لمعات میں یوں رقمطراز ہیں:

"....ادھر اتفاق سے کاٹھیاواڑ میرا آنا ہوا اور میرے قدیم دوست فخرِ جوناگڑھ جناب قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی سے اس معاملے میں متعدد بار مشورہ ہوا اور آخر رسالے کے اجرا کا مصمم ارادہ کر لیا گیا۔۔۔

سچ پوچھیے تو یہ رسالہ محترم قاضی صاحب ہی کا از سرتا پا رہین منت ہے اور انہی کی سعی اور قوت بازو کا مظاہرہ ہے اس لیے وہ کاٹھیاواڑ اور گجرات کی

طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

شہاب کے مدیروں نے نیک نیتی کے ساتھ اسے نکالنا شروع کیا تھا اور اسے معیاری رسالہ بنانے نیز اسے جاری رکھنے کے لیے بڑی کوششوں کے ساتھ مالی قربانیاں بھی دیں۔ ان سب کے باوجود دیگر کئی اردو رسالوں کی طرح شہاب بھی بند ہو گیا۔ اس کے بند ہو جانے کے اسباب تلاش کرنے سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب کی فائل پر نظر ڈال لی جائے تاکہ اس کی ادبی اہمیت اور اردو زبان کی خدمات کا اندازہ ہو سکے۔

شہاب کی زیر نظر فائل میں کل آٹھ شمارے شامل ہیں۔[۹] شہاب کے ہر شمارے میں لمعات کے عنوان سے سید ابوظفر ندوی کے رشحات قلم نظر آتے ہیں۔ اس حصے میں خاص طور پر اس وقت کے کاٹھیاواڑ اور گجرات کے عام حالات ادبی سرگرمیوں اور سربرآوردہ شخصیتوں کے بارے میں اہم اور دلچسپ معلومات مندرج ہوتی ہیں۔ جون ۳۴ء کے شمارے میں سید ابوظفر ندوی نے "زبان" کے دوبارہ اجرا کی بھی خبر دی ہے[۱۰] مگر وہ دوبارہ شایع نہیں ہو سکا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خوشتر منگرولی ۱۹۲۸ء کے بعد بھی کئی برسوں تک رسالہ زبان کے احیا کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

شہاب کے اس فائل میں موجود شماروں میں ملک کے لکھنے والے محققوں نقادوں، ادیبوں اور شاعروں کے قلم سے مقالات کے عنوان سے کل ۲۱ تحقیقی مقالات، تاریخ کے عنوان سے کل دس مضامین اور ادبیات کے عنوان سے کہانی اور افسانہ جیسی اصناف میں کل ۴۱ نگارشات اس فائل میں

شامل ہیں۔ منظومات کے عنوان سے اردو میں ۱۳۱ اور فارسی میں بھی دو چھپی ہیں۔

شہاب میں جو علمی مقالات شایع ہوئے ہیں ان میں سے چند کے عنوان اور لکھنے والوں کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) **علم مواقیت الصلوٰۃ**: از پروفیسر محمد علی ترمذی منگرولی۔ نماز کے اوقات متعین کرنے کے بارے میں یہ ایک محققانہ رسالہ ہے۔ جو ۶ قسطوں میں (جنوری تا جون ۴۳ء) شایع ہوا تھا۔

(۲) **بوہرہ قوم کی اصلیت**: از سید ابوظفر ندوی۔ یہ مقالہ تین قسطوں میں شایع ہوا۔ گجرات میں بسنے والی تاجر "بوہرہ" قوم جو اب سُنی بواہر کے نام سے پہچانی جاتی ہے، اس کی اصل کے بارے میں تحقیقات کی یہ پہلی کوشش تھی۔

(۳) **ولی گجراتی**: از سید منظور حسن صاحب علوی الحسینی احمد آبادی۔ مقالہ نگار مشہور نقاد اور اردو اکادمی گجرات کے صدر پروفیسر وارث حسین علوی کے والد بزرگوار تھے۔ جو حسینی پیر کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ ولی گجراتی پر لکھے گئے مقالوں میں یہ بڑا اہم مقالہ خیال کیا جاتا ہے۔

(۴) **یاجوج وماجوج**: مترجم قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی۔ یہ مقالہ سب سے پہلے عربی زبان میں مصر کے مجلہ الہلال میں پروفیسر طنطاوی جوہری کے قلم سے شایع ہوا تھا۔ اس کا فارسی ترجمہ طہران کے فارسی مجلہ ارمغان بابت دسمبر ۱۹۳۳ء میں علی رضا میرزا خسروانی کے نام سے شایع ہوا تھا۔

(۵) **مسلمانان چین**: مترجم محمد اشرف علی فاروقی شمسی۔ بی۔ اے (علیگ) شہاب کے مدیر کے نوٹ کے مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۲ء کو آئزک میسن الیف، آر، جی، ایس نے "مسلمانان چین" پر ایک مقالہ چائنا سوسائٹی کے سامنے پڑھا تھا، اسی کا یہ اردو ترجمہ ہے۔

شہاب میں لکھنے والوں کی فہرست طویل تو نہیں البتہ اہم ضرور ہے۔ درج ذیل نام اردو زبان وادب کی اور خطۂ گجرات خصوصاً کاٹھیاواڑ کی اردو خدمات کی تاریخ کی کڑیاں ملانے کے لیے نہایت ضروری ثابت ہوسکتے ہیں۔

(۱) جناب اسمٰعیل برہانی (۲) مولوی حکیم عبدالسلام صاحب دسنوی عظیم آبادی (۳) سید نواب علی صاحب (۴) عبدالوہاب خان (۵) فصیح الحق عباسی نیر منگرولی (۶) فضل الحق عباسی رسا بڑودوی (۷) منیر الدین غوثی۔ احمد آبادی (۸) سید محمد عمر صاحب حسنی۔

شہاب میں لکھنے والوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر جوناگڑھ کے ریاستی ملازم رہے ہیں۔ انھوں نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی بھی خدمت کی تھی۔

شہاب کے جولائی ۱۹۳۴ء کے شمارے میں تنقید رسائل کے عنوان سے چند معاصر اور ایک گجراتی رسالے کے بارے میں بھی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض رسائل کے نام درج ہیں: (۱) خیابان، لکھنؤ۔ ماہوار رسالہ۔ اعزازی ایڈیٹر: سید شہنشاہ حسین رضوی اور سید محمد حسن خاں احسن طباطبائی۔ (۲) زندگی (امرتسر)۔ ایڈیٹر: سیوا دھاری سنیاسی۔ جوائنٹ

ایڈیٹر: روشن لال (۳) ندیم (گیا، بہار) ایڈیٹر: انجم گیاوی۔ (۴) غالب
(منٹگمری، پنجاب) ایڈیٹر: سید عبدالرشید یزدانی جالندھری (ادبی مصور رسالہ)
(۵) گجراتی رسالہ "ارون"۔ جوناگڑھ۔ ایڈیٹر: چھگن لال نانا وٹی ناگر۔ نائب
ایڈیٹر: قاسم علی ترمذی (مصور رسالہ)

گجرات سے تعلق رکھنے والے اور دوسرے اہل قلم جو شہاب سے ہر قسم کا
تعاون کیا کرتے تھے ان میں سے اکثر کے نام سے بھی آج کا اردو داں طبقہ شاید
ہی واقف ہو، ایسے حضرات کا نام اور پتہ ہمیں شہاب کی اس فائل ہی کے
ذریعہ چلتا ہے۔ غرض رسالہ زبان کی طرح رسالہ شہاب بھی ایک اہم دستاویز
ہے اور اردو کی صحافتی تاریخ کا یہ ایک ایسا درخشاں ستارہ ہے جس کی روشنی
نے کئی ستاروں کو چمکایا، گو وہ خود معدوم ہو گیا لیکن اپنے پیچھے نور کی کئی کرنیں
چھوڑ گیا ہے۔

" مضامین اختر جوناگڑھی" میں مشمول "اردو کا صحافتی ادب" میں زبان
اور شہاب کے بارے میں قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ کاٹھیاواڑ ایسے
دور افتادہ ملک سے بھی سنہ ۱۹۲۶ء اور سنہ ۱۹۳۴ء میں دو اچھے رسالے میری نگرانی
اور ادارت میں جاری ہوئے یعنی زبان منگرول سے اور شہاب جوناگڑھ سے
دو دو سال جاری رہنے کے بعد بند ہو گئے"

قاضی صاحب کے آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی طرح شہاب
بھی سنہ ۱۹۳۴ء سے دو سال تک نکلتا رہا اور پھر بند ہو گیا۔ قاضی صاحب کے
اس بیان کے علاوہ شہاب کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس کے کل کتنے

شمارے نکلے یا ان شماروں کی دوسری فائلیں یا متفرق شمارے کہاں کہاں ہیں؟
ایک بات ضرور ہے کہ شہاب کے اجراء سے پہلے ہی اس کے دونوں مدیر زبان
کا جو حشر ہوا تھا اس سے بخوبی واقف تھے نیز یہ بھی جانتے تھے کہ لکھنے اور
خریدنے والوں کے تعاون کے بغیر رسالہ نہیں چل سکتا اور یہ بھی کہ گجرات میں
اور خاص طور پر کاٹھیاواڑ جیسے علاقے میں جہاں کے مسلمان باشندوں کی زبان
بھی گجراتی ہو وہاں تو مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ قاضی صاحب اور
ندوی صاحب دونوں نے خوشتر منگرولی کے نام اپنے خطوں میں اپنے خدشات
کا ذکر بار بار کیا ہے اور کبھی نامساعد حالات کی تو کبھی خریداروں کی بے التفاتی
سے پیدا ہونیوالی مالی دشواریوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس سے بظاہر تو یہی
لگتا ہے کہ دوسرے اردو رسائل کی طرح شہاب بھی ناقدری کا شکار ہو کر
بند ہو گیا لیکن ندوی صاحب کے ایک خط سے جو خوشتر منگرولی کے نام ہے
اور اس پر تاریخ درج نہیں ہے کچھ دوسری وجہیں بھی سامنے آتی ہیں۔
ملاحظہ ہو:۔

"…. اس کے علاوہ ابتدائی دو تین ماہ میں قاضی صاحب کام کرتے رہے
اس کے بعد آج تک میں تنہا ہی اس کو کر رہا ہوں، ان کا اسم گرامی برائے
نام تبرکاً ہے۔ آج تک نہ تو ایک پائی خرچ کی نہ ایک مضمون شایع کیا۔ اس وقت
صرف اپنے قوت بازو سے چلا رہا ہوں"۔

اور آگے لکھتے ہیں:

"مشکل یہ ہے کہ نہ تو کوئی مالی امداد کرتا ہے نہ ہمت دلاتا ہے بلکہ لوگ مشکوک

نگاہوں سے دیکھتے ہیں، گویا کہ ہزاروں روپے کی شہاب کی آمدنی ہے جو میں
ہضم کر جاتا ہوں۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ قاضی صاحب نے شہاب کے زیر نظر شماروں میں سے کسی ایک کے لیے بھی طبع زاد مضمون نہیں لکھا، حالانکہ اس دوران ان کے تحقیقاتی مقالے ملک کے دیگر موقر رسالوں میں شایع ہو رہے تھے۔ البتہ انکی شعری کاوشیں شہاب کے ہر شمارے کی زینت بنتی تھیں۔ اس لیے ندوی صاحب اپنی شکایت میں ایک حد تک تو حق بجانب تھے۔ البتہ انہوں نے کسی کی بھی طرف سے مالی مدد نہ ملنے کی جو بات کہی ہے اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

ایک اور غیر مورخہ خط میں ندوی صاحب نے اپنے شریک کار یعنی قاضی صاحب کے بارے میں جو رائے قایم کی ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی:

"میرے لیے یہ بھی مشکل ہے کہ موجودہ امرائے کاٹھیاواڑ میرے شریک کار سے سخت نفرت کرتے ہیں اور اس سبب سے مجھے کہیں سے کوئی مدد نہیں مل سکی...."

جوناگڑھ ریاست میں خصوصاً اور کاٹھیاواڑ کی دیگر ریاستوں میں عموماً نیز پورے بمبئی علاقے میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی جو پوزیشن تھی اس سے اس علاقے کی سیاسی و معاشرتی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے احباب بخوبی واقف ہیں۔ خاص طور پر منگرول اور ماناودر جیسی قریب کی مسلم ریاستوں کے والی بھی آپ کے قدردان تھے۔ اس حالت میں یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ امرائے کاٹھیاواڑ قاضی صاحب سے سخت نفرت کرتے ہوں۔

شہاب کے بند ہونے کے کئی وجوہ ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک دونوں مدیروں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات بھی ہو سکتے ہیں اور ایک دوسری وجہ بھی سامنے آتی ہے۔

سید ابوظفر ندوی ۱۹۲۴ء سے پیشتر احمد آباد کے گاندھی جی کے قایم کردہ ودیالیہ نامی تعلیمی ادارے سے منسلک تھے۔ لیکن خوشتر منگرولی کے نام خطوط میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ اگر انہیں کاٹھیاواڑ کی دیسی ریاستوں میں کوئی ملازمت مل جاتی تو بہتر ہوتا۔ ۱۹۳۱ء کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ ندوی صاحب نے منگرول کی ریاست میں کسی مولوی کی جگہ کے لیے درخواست بھی بھیجی تھی۔ اس کے علاوہ وہ خط جس میں قاضی صاحب کی شکایت کی تھی اس میں یوں بھی لکھا ہے کہ اگر جوناگڑھ میں انہیں ۵۰ روپے ماہوار کی ملازمت مل جاتی تو وہ شہاب کو چلاتے رہتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

(۱) ندوی صاحب شہاب کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے جوناگڑھ چلے گئے تھے، لیکن وہاں پر انہیں کوئی ملازمت نہیں ملی تھی اور کسی ذریعۂ آمدنی کے نہ ہونے سے وہ مایوس ہو گئے تھے۔ (۲) کاٹھیاواڑ دیسی ریاستوں کا علاقہ تھا، جہاں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا جال بچھا ہوا تھا جن کے حکمراں اور امرا کے طبقوں میں سیاسی رسہ کشی چلتی رہتی تھی اور ندوی صاحب جیسے مرنجاں مرنج خالص علمی طبیعت والے شخص کو وہ ماحول راس نہیں آسکتا تھا۔ لہذا وہ اتنے دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ خوشتر منگرولی کو بھی لکھ دیا کہ ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو منگرول سے آیا تھا، جس سے معلوم ہوا زبان کا اجرا آپ نے

موقوف رکھا۔ ایسی صورت میں تو شہاب کا اپنے ہاتھ میں لے لینا زیادہ مفید پڑے گا۔

حالات سے ناامید ہو کر ندوی صاحب نے خوشتر منگرولی کے سامنے ایک اور تجویز پیش کی۔ وہ لکھتے ہیں:

"..... ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ بجائے زبان دوبارہ جاری کرنے کے اسی شہاب کو لے لیں اور اپنے نام سے جاری کر لیں۔ قاضی صاحب کا نام تو قطعاً نکال دینا پڑے گا اور اس کے عوض آپ اپنا نام داخل کر دیں اور اگر یہ تجویز پسند نہ ہو تو میرا نام بھی نکال دیں، صرف اپنا نام رکھیں۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر خوشتر منگرولی شہاب کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تو وہ چل سکتا ہے۔ یعنی انہیں تو یہی امید تھی کہ شہاب کو چلایا جا سکتا ہے، سوال صرف دونوں مدیروں کے اختلاف کا تھا۔ لہٰذا اگر مدیر الگ ہو جائیں تو دیگر مشکلات پر قابو پانا آسان ہو جائے گا۔

بہر حال شہاب بند ہو گیا لیکن قاضی صاحب کے قول کے مطابق "دو سالہ زندگی میں شعر و ادب کا قیمتی سرمایہ چھوڑ گیا۔"

حوالہ جات

۱؎ زبان کی دوبارہ اشاعت کی تقریب، اردو اکادمی گجرات کی جانب سے احمد آباد میں منعقد ہوئی تھی۔ اس موقع پر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے سابق ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار بھی احمد آباد تشریف لائے تھے ۲؎ سید ابوظفر ندوی کے مختصر حالات زندگی اور علمی خدمات کے بارے میں "حالات مصنف" کے عنوان سے جناب

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا مقالہ: گجرات کی تمدنی تاریخ مولفہ سید ابوظفر ندوی مطبع معارف، اعظم گڈھ ۱۹۶۲ء صفحہ ۳-۸۔ سید ابوظفر ندوی نے اپنی پوری زندگی احمد آباد میں گزاری لیکن احمد آباد یا گجرات سے ان کے بارے میں کسی نے اب تک کچھ نہیں لکھا ۳؎ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے مختصر حالات اور ان کی تمام کتابوں اور مقالات وغیرہ کی مکمل فہرست کے لیے دیکھئے "ہماری زبان" دہلی ۲۲ دسمبر ۱۹۹۰ء اور یکم جنوری ۱۹۹۱ء ۴؎ اردو ادب کی بازیافت۔ ماہنامہ زبان، منگرول ۱۹۲۶-۱۹۲۸ء۔ شایع کردہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء۔ صفحہ ۳۶ ۵؎ "میرے نام" عبدالرحمن خوشتر منگرولی کو لکھے گئے خطوط کا مجموعہ۔ ناشر: عرب محمد محسن اور عرب خالد احمد۔ زیڈ/۲۰۔ بلاک ڈی۔ تاج محل روڈ۔ محمد پور۔ ڈھاکا (بنگلادیش)۔ اس مجموعے میں قاضی احمد میاں اختر کے گیارہ فروری ۱۹۲۲ء سے ۷ جولائی ۱۹۵۲ء تک کے کل ۶۸ خطوط اور سید ابوظفر ندوی کے ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ء سے ۴ دسمبر ۱۹۳۵ء تک کے کل ۱۳ خطوط شامل ہیں ۶؎ "میرے نام"۔ ورق ۸۴۔ خط بابت ۹ جون ۱۹۲۷ء اور ورق ۸۶۔ غیر مورخہ خط بابت ۱۹۲۷ء ۷؎ "میرے نام"۔ ورق ۱۲۴۔ خط بابت ۱۹ جون ۱۹۲۷ء ۸؎ "میرے نام"۔ ورق ۱۲۶۔ خط بابت ۷ فروری ۱۹۳۱ء ۹؎ شہاب کا مکمل فائل دارالعلوم حنفیہ، مانگرول سے حاصل کرنے کے بعد حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف کتب خانہ، احمد آباد کے مالی تعاون سے اس کی فوٹو کاپی تیار کرائی گئی، اس کتب خانہ اور درگاہ شریف ٹرسٹ کے عہدہ داروں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے شہاب کے فائل کی ایک فوٹو کاپی مجھے بھی عنایت فرمائی۔ اس فائل کی ایک فوٹو کاپی درگاہ شریف کے کتب خانہ میں بھی محفوظ ہے ۱۰؎ شہاب بابت جون ۱۹۳۴ء کے

شہاب

"لمعات" میں سید ابوظفر ندوی رقمطراز ہیں : " کاٹھیاواڑ کی دو اسلامی ریاستوں سے بیک وقت دو اردو رسالوں کا اجرا اہل ملک کے حق میں فال نیک کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ یہ معلوم کرکے ہمیں بے حد مسرت ہوئی کہ ہمارے مکرم دوست جناب خوشتر منگرولی 'زبان' کی نشاۃ ثانیہ پر آمادہ ہوگئے ہیں اور آغاز ماہ جون سے اس کی اشاعت کا مژدہ سنا رہے ہیں۔" ۱۱ مضامین اختر جوناگڑھی، صفحہ ۴۱۲-انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۸۹ء ۱۲ گاندھی جی نے احمد آباد میں "مہاودیالیہ" نامی قومی تعلیمی ادارہ قایم کیا تھا جسے بعد میں گجرات ودیاپیٹھ نام دیا گیا۔ یہ ادارہ اب قومی یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں "ہندوستانی" کی تعلیم کے تحت اردو زبان وادب کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ گاندھی جی کے دور میں مہاودیالیہ میں ابوظفر ندوی صاحب عربی کے معلم تھے۔

عرب اور فن تحریر کا عروج وارتقا

از

جناب سرور عالم ندوی

اچھے اور مفید انسانی افکار وخیالات اور نظریات ومعتقدات کی قدرشناسی دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب نے کی ہے۔ اقوام وملل کی تاریخ بتاتی ہے کہ ابتدائے آفرینش ہی سے انسانی افکار وخیالات کو باقی ومحفوظ رکھنے کے لیے نت نئے اور انوکھے طریقے ایجاد ہوتے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ زمانہ دراز اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی روئے زمین پر بسنے والی مہذب اور متمدن قوموں کے عقائد ونظریات اور افکار وخیالات کو تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ رکھا ہے، اب یہ مدفون خزانہ عصر حاضر کی جدید تحقیق وتفتیش اور آثار قدیمہ کے ماہرین کی سعی وکاوش سے برآمد ہوتا جارہا ہے۔

حجری عہد سے لے کر اب تک اقوام عالم نے انسانوں کے علمی، فکری، تہذیبی اور ثقافتی کردار کو محفوظ کرنے کے جو ذرائع اختیار کیے ہیں ان میں سب سے پائدار اور مستحکم ذریعہ کتابت ہے گو اس کی تحقیق نہیں ہوسکی ہے کہ فن تحریر کی ابتدا کب ہوئی تاہم کتب تاریخ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فن تحریر کے عروج وارتقا میں صحرائے عرب کے ان بادیہ نشینوں کا خاص عمل دخل رہا ہے

جنھیں امی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ؎ کیا امیوں نے جہاں میں اجالا جن قوموں نے اس فن کو زیادہ فروغ دیا ان میں سامی النسل سمیری اور مصری سرفہرست ہیں۔

سمیری قوم نے تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح بابل کو اپنا مسکن بنایا تھا، جو دریائے دجلہ و فرات کے درمیان ایک نہایت زرخیز و شاداب علاقہ تھا، مصری قوم دریائے نیل کے ساحل پر آباد تھی جس کو دنیا کے مہذب و متمدن اقوام میں اولیت کا درجہ حاصل ہوا، اس نے علم وفن کے نقوش پتھروں اور لکڑیوں کے بجائے کاغذ پر ثبت کیے، اس طرح فن تحریر کی ابتدائی صورت ظہور میں آئی مگر اس وقت کا یہ متمدن اقوام اپنی تحریر کو تصویری اور تصوری علامتوں کی حدود سے آگے نہیں بڑھا سکی تھیں کہ ان کا زوال و انحطاط شروع ہو گیا اور ان کی جگہ پر عکادی قوم پوری سیاسی اور تہذیبی شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوئی۔

"عکادی" صحرائے عرب کے شمالی وسطی حصے کے وہ سامی النسل عرب تھے جو تقریباً دو ہزار ق م میں دجلہ و فرات کی سرزمین میں آکر آباد ہوئے تھے۔ انھوں نے تنزل پذیر سمیری قوم کی تہذیب و تمدن کے ایوان پر اپنی بزم آراستہ کی اور اپنی اولوالعزمی اور حوصلہ مندی اور بلند خیالات و نظریات کی بنا پر اس میں مزید برگ و بار پیدا کیے، اس طرح دو عظیم الشان تہذیبیں وجود میں آئیں جنھیں بابلی اور آشوری کے نام سے جانا جاتا ہے، ان کی بدولت فن تحریر کو تصویر و تصور کی دنیا سے نکال کر صوتی رسم الخط سے آشنا کیا گیا اور بتیس[۳۲] حروف تہجی پر مشتمل باقاعدہ رسم الخط کا آغاز کیا گیا جسے تاریخ میں "کیونی فارم حروف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس رسم الخط کے ذریعہ فن تحریر کو بڑی ترقی بھی ملی اور اس کا عمل بھی بہت تیز اور سہل ہو گیا، جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت آسان ہو گئی اور وسیع پیمانے پر کتب خانے وجود میں آگئے۔

اس "کیونی فارم حروف" کی مقبولیت کا اندازہ وادیٔ فرات سے سواحل روم تک فلسطین، شام، لبنان، حتیوں کے دارالسلطنت بوغازول (موجودہ استنبول) کے قریب واقع تھا، ایران اور ایلم کی سرزمین سے برآمد ہونے والے آثار سے لگایا جا سکتا ہے، اسی عہد کا ایک منظوم ادبی شاہکار "داستان گلگا میش" آج بھی برٹش میوزیم کی زینت بنا ہوا ہے جسے برطانوی ماہر آثار قدیمہ "سر آسٹن لے یارڈ" نے آشوری کے دارالسلطنت نینوا کے کھنڈر سے ۱۸۵۳ء میں نکالا تھا، لیکن گردش ایام نے اس قوم کو بھی آخر کار اپنی گرفت میں لے لیا اور کیخسرو نے ۵۳۹ق م میں بابل کو اپنے زیر نگیں کر کے اس "کیونی فارم حروف" کو ختم کر دیا جسے آشوری اور بابلی تہذیب نے وجود بخشا تھا اور اس کی جگہ پر فنیقی حروف رائج ہو گئے۔

فنیقی کو اہل یونان فونیشین PHOENICIONS کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ سامی النسل شمالی عرب قوم ہے، جناب ممتاز لیاقت صاحب تاریخ بیت المقدس نے رقم فرمایا ہے کہ مقام بیت المقدس میں پہلے پہل آل سام ۲۵۰۰ قبل مسیح میں جو کنعنی یا فونیقی کہلاتی تھی آباد ہوئی، آل سام کے یہ قبائل جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے یہاں پہونچے تھے، پھر انھوں نے بعد میں علاقہ روم کو اپنا مستقر بنایا،

بحر روم کے مشرقی حصہ لبنان کے ایک چھوٹے سے علاقہ سے ابھرنے والی یہ قوم عالی حوصلہ، بلند خیال اور وسیع النظر تھی، سمندر کی موجوں سے کھیلنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتی تھی بحری سیاحی اس کا مشغلہ تھا، اس نے تمام قوموں کے تہذیبی عناصر کے مجموعہ سے ایک شاندار تہذیب و معاشرت کی بنیاد رکھی تھی اور پندرہ سو سال قبل مسیح سے پہلے ہی عکادی قوم کی بتیس[۳۲] صوتی علامتوں کو مختصر کرکے صرف بائیس[۲۲] حروف تہجی کا ایسا رسم الخط تیار کیا جسے دنیا کی ہر قوم (سریانی، عبرانی، آرامی اور یونانی) نے قبول کیا اور آج جہاں کہیں بھی فن تحریر کا کوئی سراغ نظر آتا ہے یہ اسی قوم کے تیار کردہ رسم الخط کی کرشمہ سازی ہے جس کے پہلے حرف کو فنیقی الف اور دوسرے کو بیتھ کہتے تھے، جو داہنے جانب سے شروع کیا جاتا تھا، اسی سے عربوں نے الف اور با کی بنیاد رکھی، انگریزوں نے A اور B کا تصور دیا، دیوناگری نے अ اور ब کو وجود بخشا، یونانیوں نے پندرہ سو سال قبل مسیح میں اسی سے اپنا الفابیٹ بنایا جو ابتدا میں داہنے سے بائیں کی طرف شروع ہوتا تھا مگر بعد میں اسے بدل کر بائیں سے داہنے کی جانب کر دیا گیا، پھر یونانیوں کے الفابیٹ سے ہی رومن رسم الخط بنا اور رومن رسم الخط سے تقریباً سات سو قبل مسیح میں لاطینی حروف کی بنیاد پڑی۔ سوائے چین اور جاپان کے تمام ایشیائی یعنی عربی، ہندی، ترکی، ایرانی وغیرہ خط بھی اسی فنیقی حروف سے ماخوذ ہیں۔ جس کا اظہار و اعتراف پروفیسر پیرزادہ محمد ابراہیم حنیف (دہلی) کی علوم السنہ کی مجلس "شری کرشن اسمبلی" نے اس طرح کیا ہے کہ یورپ کی انگریزی اور دیگر زبانوں کے حروف تہجی عبرانی زبان سے ماخوذ ہیں مثلاً ابجد A.B.G.D،

کلمن K.L.M.N قرشت QRST وغیرہ (از معارف دسمبر ۱۹۳۷ء)

ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں ابن کوفی کے حوالے سے ان اولین چھ افراد (۱) ابوجاد (۲) ہواز (۳) حطی (۴) کلمون (۵) سعفص (۶) قرشت کا تذکرہ کیا ہے جن کا فنیقی حروف کی ایجاد و اختراع میں نمایاں حصہ رہا ہے صاحب کشف الظنون نے ان کا تعلق قبیلۂ طسم سے بتایا ہے اور ایک دوسری روایت کے مطابق یہ ملوک مدین کے اسماء ہیں، ان کے حروف کی ترتیب یہ بتاتی ہے کہ آج پورے خطہ ارضی پر فنیقی حروف کے آغاز سے لے کر زمانۂ مابعد تک عروج و ارتقا کے تمام مدارج طے کرنے کے بعد جتنی بھی زبانیں رائج ہیں وہ سب کی سب انہیں حروف سے مستعار ہیں جن کے موجدین بقول ابن ندیم عرب عاربہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے یہ روایت ہشام کلبی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

عربوں کی جودت طبع اور قوت اختراع نے صرف حروف کے ایجاد پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اپنے مخصوص طرز تحریر اور عربی رسم الخط سے علم و تحقیق کی پرپیچ اور دشوار گزار راہوں کو مزید آسان کر دیا جو سن عیسوی سے سینکڑوں برس پہلے ہی وجود میں آچکا تھا اور جس کا سہرا ابن ہشام نے اپنی سیرت میں "ان اول من کتب الخط العربی"، کے ضمن میں "حمیر بن سبا"، کے سر باندھا ہے، لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اخیر میں ایسا رسم الخط وجود میں آیا جس نے علوم و معارف کی نشر و اشاعت کے لیے مہمیز کا کام دیا۔ چونکہ عربی رسم الخط سے پہلے سریانی، عبرانی، آرامی، یونانی

اور ان سے نکلنے والی تمام زبانوں کے حروف میخی حروف کی طرح الگ الگ لکھے جاتے تھے جن کو لکھنا اور پڑھنا ایک مشکل اور دیر طلب کام تھا، اس لیے علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں رکاوٹ کا پیش آنا یقینی تھا، لیکن خط عربی ابن خلدون کے بقول دولت تبابعہ کے عہد میں ضبط و استحکام اور خوبی کے لحاظ سے بلند ترین درجہ تک پہونچا ہوا تھا اور بلاذری نے فتوح البلدان میں اسکے وضع کرنے والوں کی تعداد تین بتائی ہے جو قبیلہ طئی سے تعلق رکھتے تھے، انکا نام مرامر بن مرہ، اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ تھا، انہی کی مشترکہ کوششوں سے عربی رسم الخط کا ظہور ہوا اور ان سے اسے بعض اہل انبار نے سیکھا اور اہل انبار سے اہل حیرہ نے اور اہل حیرہ سے اہل مکہ نے، جنھوں نے اپنے مخلوطی طرز تحریر سے اس کے پیچ و خم کو درست کر کے اور حروف کو باہم ملا کر ایک ایسا مختصر طریقۂ املا و کتابت پیدا کیا جس سے انسان کا اخذ و استفادہ آسان ہو گیا، اس کی وجہ سے آدمی کی نگاہ آسانی کے ساتھ حروف و الفاظ پر پڑتی ہے اور ایک ہی نظر میں پورا لفظ اپنی مکمل معنویت کے ساتھ اس کے پردۂ ذہن پر ثبت ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ یہ صحرانشینوں کی قوت متخیلہ کا ایک عظیم الشان اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے جو علم و تحقیق کی دنیا کے لیے قندیل رہبانی ثابت ہوا، جن عربوں کو علم و تحقیق سے آشنائے محض خیال کیا جاتا ہے، علامہ آلوسی نے بلوغ الارب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ اسلام کی آمد سے مدتوں پہلے ہی عرب تہذیبی، تمدنی، علمی اور فکری حیثیت سے ممتاز تھے، جن کے ذریعہ ابتدائی

ٹکڑوں سے لے کر فنیقی حروف کے آغاز اور اس کے بعد تک کا زمانہ علم و تحقیق کے صحرانوردی اور بادیہ پیمائی کرنے والوں کیلئے کھلی کتاب بن گیا ہے، جس میں انسانوں کے شعور و احساس، تہذیب و معاشرت عقائد و نظریات اور خیالات و رجحانات کو پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے اور اسی عرب قوم کے جس کو علم و تحقیق سے ناآشنائے محض خیال کیا جاتا ہے۔ اس بے مثال کارنامے پر بے ساختہ سر دھننے کو جی چاہتا ہے جن کی بدولت ساری دنیا میں علم و فن کی شمع روشن ہے گو یہ بھی واقعہ ہے کہ سرزمین عرب پر اسلام کی آمد سے قبل لکھی جانے والی کتاب کا تاریخ میں پتہ نہیں چلتا مگر اس کے پس پردہ کونسی چیز کارفرما تھی یہ ایک الگ موضوع ہے جو ارباب علم و نظر کو دعوت تحقیق دے رہا ہے۔

ماخذ و مصادر

۱۔ سیرت ابن ہشام ۲۔ الفہرست لابن الندیم ۳۔ مقدمہ ابن خلدون ۴۔ فتوح البلدان البلاذری ۵۔ آثار البلاد للقزوینی ۶۔ بلوغ الارب لآلوسی ۷۔ صبح الاعشیٰ لقلقشندی ۸۔ کشف الظنون لحاجی خلیفہ ۹۔ تاریخ اقوام عالم از مرتضیٰ احمد خاں ۱۰۔ تاریخ ادبیات عالم از عبدالوہاب اشرفی ۱۱۔ کتاب کی تاریخ از شایاں قدوائی ۱۲۔ معارف اعظم گڈھ۔

.13, ALFABET BY TAYLARER. 14 WORLD ALPHABET THEIR ORIGIN AND DEVELAPMENT BY ISHWAR CHANDRA RAHI.

امام بخش صہبائی کی تنقید نگاری

از جناب ذاکر حسین ندوی

انیسویں صدی میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب گل ہونے لگا تو ملک میں ہر طرف شورش اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی لیکن اس اتھل پتھل اور سیاسی انحطاط کے زمانے میں بھی دہلی اصحاب علم و فن سے معمور تھی۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلما اپنی شہرہ آفاق کتاب "گل رعنا" میں لکھتے ہیں :

"دلی اس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی، بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاءالدین نیر، شاہ نصیرالدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمن خاں احسان، میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا ہوگا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسماں کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا [1]"

اس دور میں جب اردو کا چرچا عام ہوگیا تھا تب بھی فارسی کے کچھ دلدادے اور شیدائی ایسے بھی تھے جو اسی زبان کے سرمایے کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ بقول مولانا ضیاء احمد بدایونی :-

"حکومت مغلیہ کے دور انحطاط میں جبکہ برصغیر ہند و پاک میں گھر گھر اردو کا

کلمہ پڑھا جاتا تھا۔ کچھ لوگ آتش پارسی کے بھی پجاری تھے۔ جن کی شعلہ نوائیوں سے بزم سخن میں گرمی پیدا ہوجاتی تھی [2]"

اس پر آشوب دور میں ایسے ادیبوں اور عالموں کی کمی نہیں تھی جنھوں نے اردو کے فروغ و ارتقا کے باوجود فارسی کو اپنے افکار و مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا، فارسی کے انھی شیدائیوں میں امام بخش صہبائی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی ذات گوناگوں صفات، مختلف خوبیوں اور متنوع کمالات کا مجموعہ تھی۔ وہ بیک وقت ایک قادر الکلام شاعر، صاحب طرز انشاپرداز، دقیقہ رس شارح نکتہ بیں محقق اور فن تنقید کے رمز شناس تھے اس مضمون میں صہبائی کے اور کمالات سے قطع نظر کرکے صرف ان کی تنقید نگاری تک بحث و گفتگو محدود رکھی گئی ہے۔ وہ اچھے تنقید نگار اور تنقیدی رموز و نکات سے بخوبی آشنا تھے۔ اس کے ساتھ ہی اساتذہ کے شعری سرمایے اور نثری خزانے پر ان کی پوری نظر تھی، نقد و تبصرہ اور موازنہ و محاکمہ میں ان کی تین کتابیں نتائج الافکار، قول فیصل، اعلاء الحق مشہور ہیں، ان کے مطالعہ سے صہبائی کی تنقیدی بصیرت، علمی موشگافی، ادبی باریک بینی، فن کی پرکھ اور نحو و صرف اور لغت میں عبور کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ ادبی محفلوں اور شعری مجلسوں میں بھی وہ اپنا یہ جوہر دکھاتے تھے، ایک مشاعرہ کی روداد سناتے ہوئے مولوی محمد حسین آزاد رقمطراز ہیں :

"دلی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا (غالب) نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی امام بخش صہبائی جلسے میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے

جس وقت یہ مصرع پڑھا ؎

بوادی کہ دراں خضر را عصا خفت است

مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ "عصا خفت است" میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت میں ہندی نژاد ہوں۔ میرا عصا پکڑ لیا۔ اس شیرازی کا پکڑا گیا ؎

ولی بجملہ اول عصای شیخ خفت است

انہوں نے کہا کہ اصل محاورہ میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں[۵۳]

ان کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت وہ اصلاحات بھی ہیں جو انہوں نے اپنے شاگردوں کے کلام پر دی ہیں جن میں ان کو ید طولی حاصل تھا۔

صہبائی نے "نتائج الافکار" میں اپنی عمر بھر کے مشاہدات، تجربات اور تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔ چنانچہ دیباچے میں انہوں نے اسکی صراحت کی ہے کہ

"فن عروض وقافیہ اور صنعت معما پر رسالے نیز حواشی وشروح اور صاحب زبان عجم کے رسائل پر تعلیقات تحریر کرنے کے بعد اب طبیعت کا میلان اس طرف ہے کہ مرور زمانہ سے جو کچھ تجربات اور مشاہدات دل میں آئے اسے ان اوراق میں واضح کروں"[۵۴]

بظاہر یہ بات آخر عمر کی ہے جب صہبائی کے علم، تجربے اور مشاہدے میں بڑی پختگی آگئی تھی۔

یہ رسالہ دو فصلوں میں منقسم ہے۔ پہلی فصل صنعت معما سے تعلق رکھتی ہے۔

جس میں اساتذہ فن کے معموں کا حل پیش کیا گیا ہے اور اکثر معموں کی بنیاد حساب جمل پر رکھی گئی ہے۔ دوسری فصل میں اساتذہ کے مشکل اشعار کی تشریح کی گئی ہے اور ان کے کلام پر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے اور جہاں کہیں انہیں شاعر کا سہو نظر آیا اس کو واضح کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے۔ عرفی کا ایک شعر ہے:

بال طاؤس از گلاب و عود رضوان پرورد — تا بسازند مروحہ در موسم گرمای من

اس پر صہبائی نے یوں گرفت کی ہے:

"عود" سہوالفکر ست، بجای آن صندل می باید"[۵۵]

عرفی کا ایک اور شعر ہے

تاکون ترا اصل مہمات نخوانند — نشنید قضا ترجمۂ لفظ اہم را

صہبائی رقمطراز ہیں:

"ترجمہ" سہوالفکر ست۔ بجای آن "مصداق" می باید۔ ای مصداق اہم ہنوز معلوم نبود۔ ہرگاہ ترا اصل مہمات گفتند معلوم شد کہ مصداق آن توئی"[۵۶]

عام خیال ہے کہ خواجہ حافظ شیرازی کا سارا کلام حقیقت کا آئینہ ہے اور جہاں کہیں مجازی معنی کھل کر سامنے آیا ہے اس کی دور از کار تاویل کی گئی ہے۔ مگر صہبائی کے خیال میں حافظ کا پورا کلام حقیقت کا پرتو نہیں ہے بلکہ ایسے بھی اشعار ہیں جن میں صرف مجازی معنی ہی کا پہلو ہوتا ہے چنانچہ وہ حافظ کے اس شعر:

نگویمت کہ ہمہ سال می پرستی کن — سہ ماہ می خور و نہ ماہ پارسا می باش

پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"..... معنی این شعر متصوفانہ گفتن وازسر راہ ونہ راہ چیزی دیگر خواستن چنانکہ شعر نافہمان می تراشند از مذاق دوری ست"[47]

اسی طرح حافظ کے لسانی ہفوات اور باطل بیانی کو بھی واضح کیا ہے ان کا ایک شعر ہے ؎

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نرفت   آفرین بر نظر خطا پوشش باد

صہبائی ارقام فرماتے ہیں :۔

"آنچہ از ظاہر این الفاظ بر می آید، آنست کہ پیر ما گفت کہ از قلم صنع خطا نرفتہ بر نظر پاک خطا پوش پیر ندکور آفرین باد کہ ہزار ہا خطا را پوشیدہ کرد و افشای آن درگذشت چہ در واقع چہ خطا کہ از قلم صنع نرفتہ نعوذ باللہ من ہفوات اللسان و اباطیل البیان۔

وما می گوئیم کہ توجیہ باید کرد کہ ازین گستاخی تبرئی دست دہد و ازین ہرزہ سرائی خلاص بدست آید و معنی ہم بہ لطف تمام بہ کرسی الفاظ نشنید وآن توجیہ این ست کہ پیر ما چنین و چنان گفت بر نظر خطا پوش او آفرین باد کہ درین ضمن صدہا خطا ہای کہ از ما سر می زند مخفی کرد چہ ہرچہ از ما سر می زند اطلاق خطا بر ان می کنند و ہرچہ از ما سر می زند ہمان ست کہ از قلم صنع سر زدہ و پیر ما گفت کہ از قلم صنع ہیچ خطا نرفتہ پس آن خطا ہا کہ از ما سر زدہ نیز خطا نماند"[48]

حافظ کا ایک اور شعر ہے :۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"راہ در ین جا بمعنی نغمہ است و نافہمان بمعنی راستہ می گویند و نمی دانند کہ راہ زدن بمعنی قطاع الطریقی کردن ورہ زنی نمودن ست"[49]

صہبائی کی یہ علمی جسارت بھی قابل توجہ ہے کہ انہوں نے حافظ کے ایک شعر پر انوکھی اصلاح دی ہے۔ پہلے شعر ملاحظہ ہو:

گر من آلودہ دامنم چہ عجب   ہمہ عالم گواہ عصمت اوست

اصلاح ملاحظہ ہو:

"ظاہر اسیاق مصرعین می خواہد کہ در مصرعہ اول لفظ "عجب" نباشد بلکہ زیان بود چہ معنی آن چنین دریافت می شود کہ اگر من گناہ گار و آلودہ دامن ہستم برای معشوق زیان ندارد و او را بعیب بی عصمتی متہم نمی کنند چراکہ در عالم کسی نباشد کہ معترف بعصمت او نخواہد ....."[50]

امام بخش صہبائی کو فن موازنہ و محاکمہ میں بھی جو دسترس تھی اس کا اندازہ قول فیصل اور رسالہ اعلاء الحق سے ہوتا ہے۔ پہلے ان دونوں رسالوں کا پس منظر بیان کر دینا مناسب ہوگا تاکہ یہ معلوم ہو کہ صہبائی نے اس میدان میں کیوں قدم رکھا تھا۔

ایران و ہند کا لسانی تنازعہ علمی و ادبی دنیا میں مشہور ہے۔ جب ہندوستان میں فارسی کا عام رواج ہوا تو بہت ساری ہندوستانی ترکیبیں، جملوں کی ساخت ہندوستانی زبان کے مفرد الفاظ، محاورات و اصطلاحات اور ضرب الامثال بھی یہاں کی فارسی ادبیات کا جزء ہو گئے اور بعض فارسی الفاظ کے مفہوم میں بھی

خاصی تبدیلی ہوگئی۔ سبک ہندی اہل ایران کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا ۱۷۴۳ء میں شیخ محمد علی حزیں ہندوستان آئے تو ان کی نظر میں بھی اہل زبان ہی قابل سند تھے۔ اس بنا پر ان کے زمانے میں جو تنازعہ اور ہنگامہ کھڑا ہوا وہ دن بدن شدت اختیار کرتا گیا گو اس سلسلہ کا آغاز دور شاہجہانی میں ہی ہو چکا تھا جب ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۱ء میں ملا شیدا نے حاجی محمد جان قدسی کے ایک قصیدے پر اعتراضات کیے تھے[۱۱] لیکن شیخ حزیں اور خان آرزو کے تنازعہ میں جو شدت پائی جاتی ہے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ خان آرزو ہندوستانی فارسی کی حمایت میں تھے اور سمجھتے تھے کہ فارسی دانی میں اہل ہند اہل ایران سے کم نہیں ہیں لیکن شیخ صاحب کی نگاہ میں ہندوستانی فارسی قابل اعتنا نہ تھی اور وہ بیدل اور ناصر علی سرہندی کی جو یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے مقتدا تھے نظم و نثر کو سرمایہ تضحیک خیال کرتے تھے۔

اختلاف و نزاع کی اس شدت کے زمانے میں جب حزیں نے اپنا دیوان مرتب کیا تو اس کے پانچ سو اشعار پر خان آرزو نے شدید اعتراضات کیے اور جواب در جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایرانی عنصر شیخ صاحب کی حمایت کرتا تھا اور تورانی لوگ خان آرزو کے حامی تھے۔

صہبائی کے دور میں اس مناقشہ کو شروع ہوئے سو سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ان سے قبل متعدد حضرات اس بحث میں حصہ لے چکے تھے چنانچہ لالہ ٹیک چند بہار نے "بہار عجم" میں، وارستہ نے "مصطلحات الشعرا" میں، میر غلام علی آزاد نے "خزانۂ عامرہ" اور فتح علی گردیزی نے "رسالہ ابطال الباطل" میں ان سب کے

مباحث کو جمع کیا ہے[۱۲] اس کے علاوہ خوشگو، عبدالحکیم حاکم، میر محسن اکبر آبادی، مرزا لطف علی اور مولوی محمد حسین آزاد نے بھی کسی نہ کسی حد تک اس میں حصہ لیا لیکن امام بخش صہبائی م ۱۸۵۷ء کا حصہ اس میں سب سے زیادہ ہے۔ "قول فیصل" و "اعلاء الحق" کی تصنیف اسی کا نتیجہ ہے۔ "قول فیصل" کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی۔ اکبر الہ آبادی نے صہبائی کی شہادت کے متعلق جو شعر کہا ہے اس میں اس کا بھی نام لیا ہے ؎

وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

اس ادبی محاکمہ میں صہبائی نے انصاف اور غیر جانبداری سے کام لیا۔ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"تماشائیان انصاف دوست ہرگاہ سرتاسر این خیابان بپایند دریابند کہ جانب ہیچکس نگرفتہ ام و براہ اعتساف نرفتہ[۱۳]"

اور خاتمہ میں لکھتے ہیں:

"نگرفتہ دلم طرف کسی را برکس ندہم شرف خسی را
ہر حرف بہ بزمگاہ تحقیق افروختہ صد چراغ تدقیق
سررشتۂ عدل را نگہ دار نی پاس گدا نہ پاس شہ دار[۱۴]"

اپنے ان دعووں کو صہبائی نے نباہنے کی کوشش کی ہے وہ نہ تو شیخ حزیں کی ایرانیت سے مرعوب ہیں اور نہ خان آرزو کی ہندوستانیت سے بیزار اور ہراساں۔ اس لیے ان پر شیخ علی حزیں کی طرف داری کا الزام بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر وہ ان کے حامی ہوتے تو یہ نہ کہتے کہ "آنچہ معترض گفتہ حق ست و حق باتباع

احق است"، "نفس الامر آنست کہ حق بجانب معترض ست"، "مصرعہ ثانی از مصرع شیخ بمراتب بہتر ست"،
"حق آنست کہ این لفظ بسہو از خاطر رفتہ"، "آری گاہ گاہ شیخ خشک مغزانہ حرف می زدند" اور "حق
بجانب معترض ست"[15] اسی طرح کہیں حزیں کی توجیہ پیش کرتے ہوئے صہبائی کا یہ کہنا کہ "اما طبع
سلیم قبول نمی کند"، کہیں "اما حق آنست کہ اگر لفظ فارغ بودی معنی شعر واضح تر و ازین تاویل مستغنی گشتی"،
کہیں "سخن آنست کہ معترض گفتہ"، کہیں "انصاف آنست کہ این توجیہ خالی از تکلف نیست"[16]، پھر کہیں
خان آرزو کی اصلاح کو "اصح" قرار دینا، کہیں "ہر چند ظاہر ہمانست کہ خان تحقیق نشان می فرمایند" کہیں
"در امثال این مقامات سپر می افگند" اور کہیں یہ کہنا کہ "حق آنست کہ در مقابلہ شادی و غم لفظ ادراک
عبث ست"[17] ثابت کرتا ہے کہ صہبائی کا طریق تنقید تحقیق و انصاف پر مبنی تھا نیز یہ بھی کہ انہوں
نے کج بحثی اور جانبداری سے کام نہیں لیا ہے۔

صہبائی کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ وہ موازنہ و محاکمہ اور نقد و تبصرہ کرتے وقت
متن پر خاص توجہ دیتے تھے اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد اصل متن کا استخراج کرکے اس کو صحیح شکل میں
پیش کرتے تھے۔ یہ بھی قابل ذکر امر ہے کہ ان کا لب و لہجہ تلخ اور درشت نہیں ہوتا مگر "اعلاء الحق"
میں ان کا لب و لہجہ تلخ اور درشت ہو گیا ہے۔

اس مختصر بحث و گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی کو زبان و بیان پر پوری قدرت اور
نقد و تبصرہ میں اچھی بصیرت تھی اور انکی کتابوں نے ایک معتدل اور متوازن تنقید کا نمونہ پیش کیا ہے۔

حواشی

[1] مولانا سید عبدالحی: گل رعنا ص ۳۲۶ [2] مولانا ضیاء احمد بدایونی: مسالک و منازل ص ۳۳۲ [3] مولوی محمد حسین آزاد: آب حیات ص ۵۵
[4] امام بخش صہبائی: کلیات صہبائی ۱/۶۳۰ [5] ایضاً ۱/۶۳۵ [6] ایضاً [7] ایضاً ۱/۶۴۸ [8] ایضاً ۱/۶۴۷ [9] ایضاً ۱/۶۵۹
[10] ایضاً ۱/۶۴۶ [11] غلام علی آزاد بلگرامی: سرو آزاد ص ۲۰۳ [12] مولوی محمد حسین آزاد: نگارستان فارس ص ۲۱۶ [13] امام بخش صہبائی:
قول فیصل ص ۸ [14] ایضاً ص ۱۶۳ [15] ایضاً صفحات ۱۸، ۲۸، ۳۰، ۳۳، ۴۳، ۴۴ و ۵۸ [16] ایضاً صفحات ۵۹، ۶۸، ۷۶، ۳۰ [17] ایضاً
صفحات ۹۵، ۱۰۰، ۱۰۸ و ۱۲۸۔

اخبار علمیہ

ترکی کی خلافت اسلامیہ کے سیاسی، تمدنی و تہذیبی اثرات جن خطوں میں زیادہ
پائیدار ثابت ہوئے ان میں جزیرہ قبرص بھی ہے جس کے ساحل ۲۸ھ ہی میں
خیر القرون کے نفوس قدسیہ کے مبارک قدموں سے آشنا ہو گئے تھے بعد میں
جب ترکی کے سلاطین، خلافت اسلامیہ کے علم بردار ہوئے تو قبرص کامل طور پر
اسلام کے زیر سایہ آگیا اور ترک باشندوں نے اسے اپنے وجود اور اسلام کی
تہذیب و ثقافت سے معمور کیا، مساجد و مدارس اور کتب خانوں کی تعمیر ہوئی
جن کے نقوش آج بھی وہاں زندہ و تابندہ ہیں، کتب خانہ سلطان مراد ثانی، سلیمیہ
مسجد، لالیلی مسجد اور نیشنل آرکائیوز ان خاص اداروں میں ہیں جہاں اسلامی علوم
و فنون کے متعلق اہم کتابوں کے علاوہ قیمتی مخطوطات کا ذخیرہ موجود ہے، ۱۹۸۶ء
میں ایک منصوبہ کے تحت قبرص کے ان مخطوطات کی تلاش و اندراج کا کام
شروع ہوا اور گذشتہ سال اس کے نتیجہ میں **فہرس المخطوطات الاسلامیہ
فی قبرص** کے نام سے ایک جلد استنبول ترکی سے شایع ہو گئی، اس کا دیباچہ
قبرص کے مسلمانوں کے مشہور قائد رؤف دنیکتاش کے قلم سے اور تعارف
ترکی کے معروف محقق اور (IRCICA) کے فعال سربراہ پروفیسر احسان اوغلو
کے قلم سے ہے، ان دونوں تحریروں میں اسلامی قبرص کی سیاسی، ثقافتی اور سماجی

تاریخ کی ایک جھلک کے علاوہ وہاں کے نامور علماء، سائنسدانوں اور کتبخانوں کی تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے، اس مفید فہرست میں ۱۹۴۸ عربی، ۲۱۱ ترکی اور ۹۶ فارسی زبان کے مخطوطات کا اندراج ہے اور یہ تفسیر علوم القرآن حدیث، سیر، فقہ، ادب، فلسفہ، تاریخ، منطق اور فلکیات وغیرہ علوم سے متعلق ہیں، اسماء واماکن کا مفصل اشاریہ جدید ترین معیار کے عین مطابق ہے۔

بحر متوسط کے جزیرہ قبرص کی طرح بحر ہند کے جزائر خصوصاً مالدیپ اپنی خوبصورتی اور دلفریبی کے علاوہ اسلامی تہذیب کی برکات سے بھی سرسبز وشاداب ہے۔ اسی پرسکون جزیرہ کے متعلق گذشتہ دنوں یہ خبر ہلچل اور اضطراب کا باعث بنی کہ اکیسویں صدی میں وہ مکمل طور پر سمندر میں غرق ہو کر نیست ونابود ہو جائے گا، اقوام متحدہ کے سائنسدانوں کی ایک جمعیت نے وجہ یہ بیان کی کہ کرۂ ارض جس تیزی سے اعتدال سے زیادہ گرم ہو رہا ہے اس کے نتیجہ میں ۲۱۰۰ء تک سمندر کی سطح عام طور سے ۵۰ سینٹی میٹر بلند ہو جائے گی لیکن بعض مقامات پر یہ بلندی دوگنی اور تین گنی بھی ہو سکتی ہے، انٹر گورنمنٹل پینل آن کلائمیٹ چینج (IPCC) کے خیال میں مالدیپ جیسے مجمع الجزائر کے لیے سطح سمندر کی یہ تین گنی بلندی تو بہت ہے کیونکہ اس کی کم سے کم بلندی کا ایک تھپیڑا ہی اس کے ۱۱۹۰ جزیروں کے خاتمہ کے لیے کافی ہے مالدیپ کا بلند ترین حصہ سطح سمندر سے صرف ۱ء۶ میٹر اونچا ہے، اب اس امکانی غرقابی کا خطرہ وہاں کی حکومت کا سب سے سنگین مسئلہ ہے، اس کے

سدباب کے لیے وہ اقوام متحدہ سے تعاون کی خواہاں ہے، غیر یقینی مستقبل کی وجہ سے اب بیرونی تجارتی ادارے وہاں سے کاروبار ختم کرنے کی فکر میں ہیں، ایک جرمن ادارہ نے اسی وجہ سے ایک اہم تجارتی معاہدہ سے انکار کر دیا، لیکن اندیشوں اور خدشوں کے علی الرغم ایک بحری سائنسداں نیران حسن مانک کو یقین ہے کہ قدرت اس آفت کا علاج خود کرے گی، ساحلی سنگستان نے ہمیشہ اس جزیرہ کی حفاظت کی ہے، پتھریلے ساحلوں کی اس قدرتی دیوار کی صحیح نگہداشت ہوتی رہے تو مایوس اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

کرۂ ارض کی حرارت اور گرمی میں غیر معمولی اضافہ سے موسموں اور آب وہوا کا مزاج غیر معتدل ہوتا جاتا ہے اور اس سے ماحولیات کے ماہرین کا سر درد بھی شدید ہوتا جارہا ہے، شہروں کی کثرت، نتیجہ میں پٹرول گیس اور تیل کے روزافزوں صرف واسراف اور پانی کی کمی اور درختوں اور ہریالی کی غیر موجودگی نے اس مسئلہ کو انتہائی تشویشناک بنا دیا ہے، گذشتہ دنوں اسی مسئلہ پر غور وخوض کے لیے استنبول میں ورلڈ میٹرولوجیکل آرگنائزیشن (WMO) کے تحت ایک کانفرنس ہوئی، اس میں اکثر ماہرین اسی فکر میں غلطاں رہے کہ آخر اکیسویں صدی میں شہروں کی نوعیت کیا ہوگی، آج دیہات کے مقابلہ میں شہر زیادہ گرم ہیں اور ۲۰۰۰ء تک دنیا کی نصف آبادی شہروں کی ہو کر رہ جائے گی، اس وقت ایک ملین کی آبادی والا شہر روزانہ پچیس ہزار ٹن کاربن ڈائی آکسائڈ کا اخراج اور ....،۳ ٹن پانی کو برباد کرتا ہے،

پختہ فلک بوس عمارتوں کا جنگل پھیلتا جاتا ہے اور اس جنگل کی آگ میں بنی نوع انسان کی بقا ہی جھلسنے والی ہے، اس صورت میں ان جدید ترین ماہرین ماحولیات نے رجعت و قدامت پرستی کا دلچسپ نسخہ تجویز کیا، ان کا خیال ہے کہ "درحقیقت اب وقت آگیا ہے کہ لوگ اپنے اسلاف کی جانب مڑ کر دیکھیں جنھوں نے زمانۂ قدیم میں یہ حقیقت پالی تھی کہ انسان کس طرح زندہ رہے اور آب و ہوا اور ماحول کا کیا صحیح مصرف اختیار کرے"، انہوں نے انڈونیشیا کے جزیرہ بالی کی ایک عمارت کا حوالہ بھی دیا جو ۱۶۱۰ء میں تعمیر ہوئی تھی، اس کے اطراف میں صاف پانی کا ایک نالہ ہے جس سے ہوا خنک اور تازہ رہتی ہے، پہلی منزل کھلی ہوئی ہے اور چھت خیموں کے طرز کی ہے جو گرمی کی شدت کو کم کرتی ہے، ایک جاپانی ماہر نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی علامتوں ہارڈ ویر اور سافٹ ویر کے استعمال کو ہدف تنقید بناتے ہوئے یہ بلیغ جملہ کہا کہ "ان کی ضرورت مسلم لیکن ہم ہارٹ ویر کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے"۔

عالمی پیمانہ پر ملکوں اور شہروں کے تحفظ و بقا اور ماحول کی صفائی و طہارت کی یہ کوششیں ہیں تو دوسری جانب انسان کی بے حسی کی خبریں بھی بدستور ہیں، دہلی میں مزار ذوق کو عوامی بیت الخلا میں تبدیل کرنے کی خبر اب عام ہو چکی ایسی ہی ایک خبر مدھیہ پردیش کے تاریخی شہر مانڈو کی ہے جو کبھی ہندوستان کی مسلم حکومت کے سایہ میں شادی آباد تھا، مسلمان حکمرانوں کی عظمت و سطوت کی یہ یادگار اپنے اطراف میں سنگین فصیل کے حصار میں تاریخ کی رنگینی و دلنشینی کی خاموش داستانیں سمیٹے ہوئے ہے، یہ اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ اس کے قلعہ کی فصیل سے زیادہ وسیع شہر پناہ دنیا میں اور کہیں نہیں، یونیسکو نے اس کو عالمی تاریخی میراث میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا،

لیکن ہندوستان کا محکمہ آثار قدیمہ اس بیش قیمت تاریخی ورثہ سے اس درجہ لاتعلق اور بے حس ہے کہ اس قلعہ کا ایک مشہور محل جہاز محل آج محض ایک پیشاب خانہ بن کر رہ گیا ہے، یہی نہیں جہاں کبھی رانی روپ متی کا شاہی حمام تھا وہاں آج شمشان ہے۔

ہندوستان میں ماحولیات اور شہروں کی فکر دراصل برائے نام ہے، بمبئی کی اصلاح ممبئی کے ذریعہ ہوئی اور اب مدراس کا نام چنئی رکھ دیا گیا ہے، سیاستدانوں کے لیے یہ معمولی بات ہے، لیکن مورخین سرگرداں ہیں کہ آخر مدراس نام کیوں ہوا تھا؟ ایک معروف مورخ ایس متھیا نے اپنی کتاب 'مدراس ڈسکورڈ' میں لکھا کہ "لفظ مدراس کا تعلق دو اہم مقامی زبانوں یعنی تامل اور تیلگو سے بہرحال نہیں ہے، مدراس زیادہ قدیم بستی بھی نہیں، سترہویں صدی میں جان کمپنی کے اینڈ ریو کوگن اور فرانسس ڈے نے پونا ملی نامی گاؤں کو ایک تجارتی منڈی کی شکل دی، اس منڈی کو ۱۶۳۹ء سے ۱۶۷۳ء تک قریب گیارہ ناموں جیسے مدراپٹنم، مدرسہ پٹن، مدراس پٹنم وغیرہ سے پکارا گیا، مدراس نام شاید اس لیے ان سب کا جزو رہا کہ جان کمپنی کا سربراہ ایک رومن کیتھولک عیسائی مدراسن نامی تھا"، لیکن ایس متھیا نے اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ مقامی مچھیرے سینٹ تھامس کے کلیسا MADRE DE DEUS کے پیرو کار تھے، اسی مناسبت سے ان کی بستی کا مدراس نام رکھا گیا، لیکن سب سے دلچسپ ان کا یہ خیال ہے کہ قرب و جوار میں بعض مسلم مدرسوں کی موجودگی کی وجہ سے یہ مدراس ہوا۔

ع۔ص۔

ادبیات

نعت

از ڈاکٹر سعید عارفی

گونگے الفاظ نے پائے ہیں معانی تجھ سے
موج گفتار میں ہے ساری روانی تجھ سے

میری خلوت ہے ترے ذکر سے روشن آقا
ساعت ہجر بھی لگتی ہے نورانی تجھ سے

ناشناسی کے حصاروں میں گھری تھی دنیا
زیست کیا چیز ہے یہ بات تو جانی تجھ سے

کتنا بے رنگ تھا ظلمات میں ذہنوں کا سفر
کتنی خوش رنگ ہے اب اپنی کہانی تجھ سے

سادگی حرف نے پائی تری باتوں کے طفیل
نطق کے ہاتھ لگی سہل بیانی تجھ سے

لہلہاتیں کہاں فصلیں نہ اگر تو ہوتا
بارشیں تجھ سے ہیں دریاؤں میں پانی تجھ سے

رہ روان رہ تسلیم و رضا نے پائی
جادۂ زیست پہ منزل کی نشانی تجھ سے

یوں چلا مدحت آقا میں قلم تیرا سعید
موج دریا نے بھی مانگی ہے روانی تجھ سے

شمع فروزاں

از ڈاکٹر ابرار اعظمی

حامل قرآں
عامل ہر آں
صاحب فرقاں
حامل ایماں
رحمت یزداں
نافع دوراں
روئے مقدس
ماہ درخشاں
چشم مبارک
انجم تاباں
گوہر یکتا
آپ کے دنداں
اور لب انور
لعل بدخشاں
ابروئے عالی
تار رگ جاں
عرق جبیں، یا
جشن چراغاں

جسد مبارک
رشک گلستاں
قلب مطہر
پاک ز عصیاں
ذہن معطر
تاباں تاباں
نقش کف پا
مہر بہ داماں
پشت پہ مہر
نبوت رقصاں
آپ کے غم
وقف غم انساں
اور تبسم
موجۂ امکاں
حسن مجسم
شمع فروزاں
حکمت باری
سب سے نمایاں

معارف کی ڈاک

مکتوب دہلی

سنیچر۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۶ء

مجی ضیاء الدین اصلاحی صاحب، سلام ورحمت

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم پر آپ کا مضمون بہت ہی شوق اور دلچسپی سے پڑھا۔ واقعی آپ نے مضمون کا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ نے مرحوم پر مجھ سے مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی اس سے میں سخت پریشان ہوا۔ اس لیے کہ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مجھے مرحوم کے بعض خیالات اور انکی عملی زندگی کے بعض پہلوؤں سے اچھا خاصا اختلاف تھا، اس لیے اس خدمت کو میں بہ احسن انجام نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر ستمبر کے معارف میں مرحوم پر آپ کا مضمون نہ چھپا تو برا بھلا لکھ کر آپ کو بھیج دوں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی۔

جامعہ ملیہ کی صحیح صورت حال سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض ایسی باتیں قلم سے نکل گئی ہیں جو صحیح نہیں ہیں مثلاً "قائم مقام وائس چانسلر تھے"۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب کے خط میں بھی یہ فقرہ موجود ہے، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے تعزیتی جلسہ میں ایک سابق استاذ اور ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب کے گرد دوست نے کہا تھا کہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے دور میں دو گروپ تھے۔ ایک کے نمایندے ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب تھے اور دوسرے کے نمایندے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب تھے۔ راقم الحروف نے عرض کیا تھا کہ شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب ضیاء صاحب کے علمی اور ادبی ذوق سے بیحد متاثر تھے وہ انکی اسی لحاظ سے عزت کرتے تھے اور سلامت اللہ صاحب کی انتظامی صلاحیتوں کے معترف تھے اسی لیے اگر کبھی قائم مقام شیخ الجامعہ کی ضرورت پیش آتی تو انکو مقرر کرتے تھے انکی آخری شدید علالت کے زمانے میں سلامت اللہ صاحب اس وقت تک قائم مقام رہے جب تک پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے وائس چانسلر کے عہدے کا چارج نہ لے لیا۔ امید ہے کہ اس وضاحت کے بعد غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔

والسلام

آپکا : عبداللطیف اعظمی

مطبوعات جدیدہ

غالب اور انقلاب ستاون از جناب ڈاکٹر سید معین الرحمن،
متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۶۸
قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔

سلسلہ غالبیات کی یہ مفید و منفرد کتاب قریباً بیس بائیس برس پہلے پاکستان سے شایع ہوئی تھی، دو سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا اور اس سے اس کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوا، ۱۸۵۷ء میں پورے ہندوستان خصوصاً دہلی کے باشندوں پر قیامت ٹوٹی، انتقال تخت و تاج کے ساتھ ہی وفاداری اور مصلحت اندیشی کے پیمانے بھی تبدیل ہوئے، مرزا غالب کی زندگی بھی اس پرآشوب دور سے متاثر ہوئی، اس کتاب میں ان کی زندگی کے بعض گوشوں کا جائزہ اسی پس منظر میں لیا گیا ہے، اس انقلاب سے غالب کے براہ راست تعلق و تاثر کی شاہد ان کی کتاب دستنبو ہے، اس کے بعد ان کے خطوط و اشعار میں اس کے اثرات ملتے ہیں، دستنبو صرف واقعات کا روزنامچہ ہی نہیں غالب کی ایسی سرگزشت بھی ہے جس سے غالب کی مطلب براری، پنشن اور خلعت کی خواہش، اور انگریز حکام کی مدح و ستایش نمایاں ہے اور اس کا مقصد اپنی مدافعت اور نئے حاکموں سے مفاہمت ہے، اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ یہ کتاب قومی نقطۂ نظر سے لکھی ہی نہیں گئی، اس کے برعکس غالب کے اکثر جذبات و احساسات ان کے خطوط میں ظاہر

ہوئے ہیں، فاضل مصنف نے ان دونوں متضاد پہلوؤں کو یکجا کرکے بڑی خوبی سے ان کا تجزیہ و محاکمہ کیا ہے، قدرتاً دستنبو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے جس کو غالب نے اس قدیم فارسی زبان میں قلم بند کیا تھا جس کا خود بقول غالبؔ اب پارس کے بلاد میں نشان نہیں رہا، فاضل مصنف نے اس کی وجہ یہ لکھی کہ "مصلحت یہ تھی کہ معاصر اہل ہند کے لیے یہ کتاب، قفل ابجد ہو کر رہ جائے"، زیر نظر کتاب کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں دستنبو کا حد درجہ سلیس ترجمہ دیا گیا ہے جو جناب رشید حسن خاں کے قلم سے ہے اور اس سے بھی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں دستنبو کے اولین اور نایاب مطبوعہ کا مکمل عکس بھی شامل ہے جس میں غالب کی مہر کے علاوہ ایک سطر میں ان کی ایک تحریر بھی ہے، پاکستانی ایڈیشنوں میں یہ اضافہ نہیں تھا، ایک باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ انقلاب ستاون نے شاعر غالب کو اگرچہ چھین لیا لیکن نثر نگار غالب کا ظہور بھی اسی کا عطیہ ہے۔ غالبیات کے شائقین کے لیے یہ کتاب تاریخ، تنقید اور شعر و ادب کا دلکش آمیزہ ہے، شائستہ اور معتدل اسلوب نے کتاب کے وزن و معیار میں اضافہ کیا ہے، دہلی کا غالب انسٹی ٹیوٹ اس مفید و وقیع کتاب کی اشاعت کے لیے لائق مبارکباد ہے۔

کتاب صحرا از جناب حنیف ترین، متوسط تقطیع، بہترین
کاغذ اور اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت، مجلد مع خوبصورت
گرد پوش، صفحات ۱۴۴، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مولانا ابوالکلام آزاد
ریسرچ اینڈ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن ۱- سوگیا واڑہ، انصاریان، سکندرآباد
ضلع بلندشہر، یوپی ۲۰۳۲۰۵۔

اس خوبصورت شعری مجموعہ کے شاعر پیشہ کے لحاظ سے سرجن ہیں لیکن جسم انسانی کے عوارض کی اصلاح و درستگی کے علاوہ ان کی نظر روح کے زخموں اور ان کے اندمال پر خاصی گہری ہے، اس سے پہلے ان کا ایک مجموعہ 'رباب صحرا' کے نام سے شایع ہوچکا ہے جو غزلیات پر مشتمل تھا، زیر نظر مجموعہ میں صرف نظمیں ہیں، روایتی اور نثری دونوں، ان میں کمپیوٹر ایٹم اور ایڈس جیسے موضوعات کے علاوہ کچے آموں کا موسم، تتلی، سبزہ، کونپل، باد صبا اور کچی دھوپ کی نرمی و گرمی کے دلفریب رنگ بھی شامل ہیں، لطیف خیالات اور پاکیزہ احساس کی وجہ سے ان نظموں میں صحرا کی وسعتوں میں پھیل جانے والی حدی خوانی کا تموج اور نغمگی کی تاثیر آگئی ہے انھوں نے اس دلکش مجموعہ کا آغاز حمد و نعت و مناجات سے کیا اور یہ ان کی سلامتی فکر و طبع کی روشن دلیل ہے، نظم کے پیرایہ میں اس قدر موثر حمد و نعت کم دیکھنے میں آتی ہیں، مناجات کے ایک شعر میں وہ یوں دعا کرتے ہیں:

مجھ کو اقبال و حالی سا کر دار دے	میری گفتار کو حسن گفتار دے
میرے نغموں سے پیدا ہو ضرب کلیم	اے خدا مجھ سے لے کوئی کار عظیم

آمین کہتے ہوئے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان کا یہ مجموعہ کلام باذوق قارئین کے لیے سرمایہ لطف و لذت ثابت ہوگا۔

ع۔ص۔